ماہنامہ ترجمان القرآن

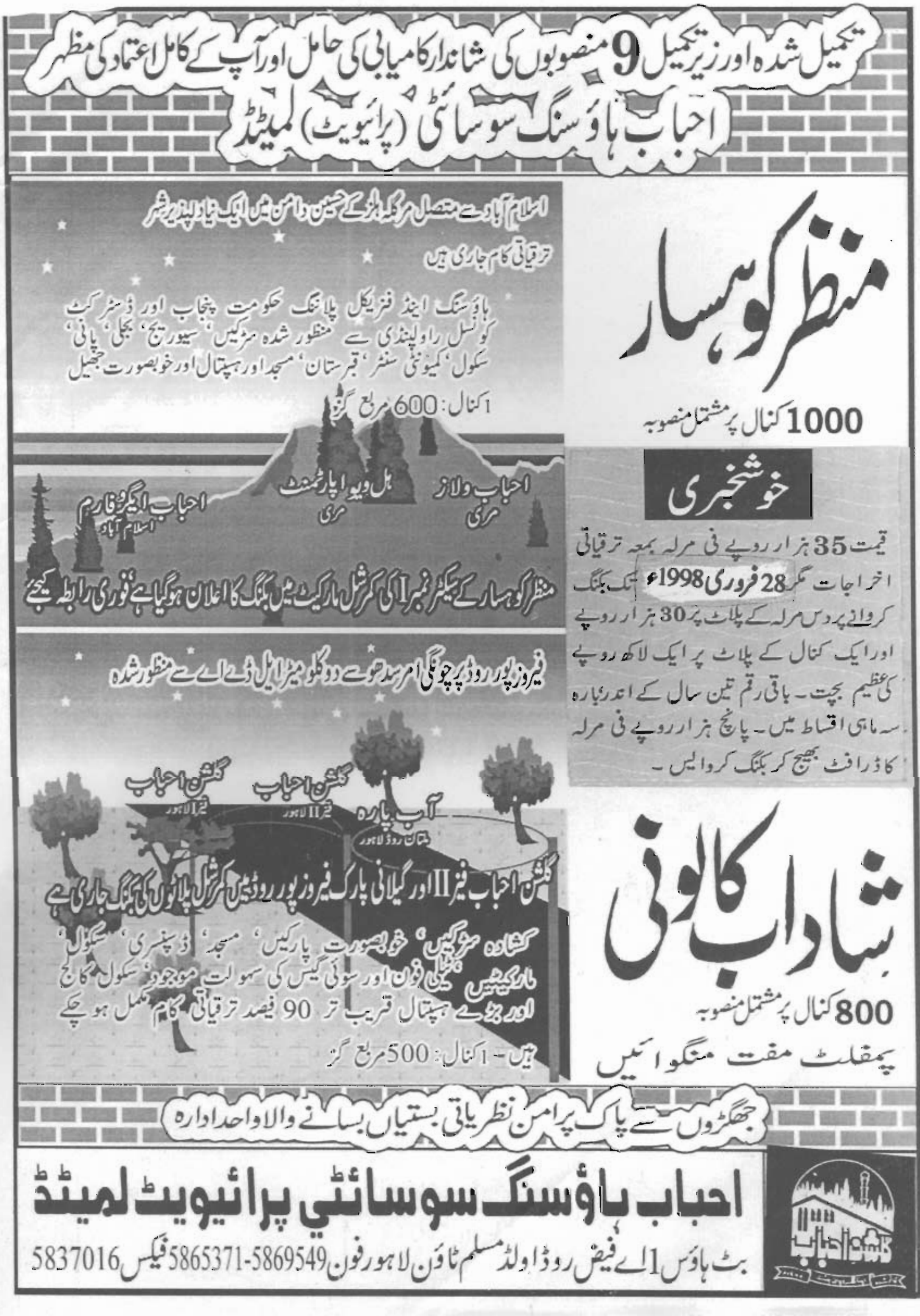
جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فروری ۱۹۹۸ء

مُدیر
خورشید احمد



اِدارۂ ترجمان القرآن



تکمیل شدہ اور زیر تکمیل 9 منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر
احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر
ترقیاتی کام جاری ہیں
ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں، سیوریج، بجلی، پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان، مسجد اور ہسپتال اور خوبصورت جھیل
1 کنال: 600 مربع گز
منظر کوہسار
1000 کنال پر مشتمل منصوبہ
احباب ولاز
مری
ہل ویو اپارٹمنٹ
مری
احباب ایگرو فارم
اسلام آباد
منظر کوہسار کے سیکٹر نمبر I کی کمرشل مارکیٹ میں بکنگ کا اعلان ہو گیا ہے فوری رابطہ کیجئے
خوشخبری
قیمت 35 ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات مگر 28 فروری 1998ء تک بکنگ کروانے پر دس مرلہ کے پلاٹ پر 30 ہزار روپے اور ایک کنال کے پلاٹ پر ایک لاکھ روپے کی عظیم بچت۔ باقی رقم تین سال کے اندر بارہ سہ ماہی اقساط میں۔ پانچ ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کروالیں۔
فیروز پور روڈ پر چونگی امر سدھو سے دو کلو میٹر ایل ڈی اے سے منظور شدہ
گلشن احباب
فیز I لاہور
گلشن احباب
فیز II لاہور
آب پارہ
ملتان روڈ لاہور
گلشن احباب فیز II اور گیلانی پارک فیروز پور روڈ میں کمرشل پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے
کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری، سکول، مارکیٹیں، ٹیلی فون اور سوئی گیس کی سہولت موجود، سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر 90 فیصد ترقیاتی کام مکمل ہو چکے ہیں - 1 کنال: 500 مربع گز
شاداب کالونی
800 کنال پر مشتمل منصوبہ
پمفلٹ مفت منگوائیں
جھگڑوں سے پاک پر امن نظریاتی بستیاں بسانے والا واحد ادارہ
احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ
بٹ ہاؤس 1 اے فیض روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور فون 5865371-5869549 فیکس 5837016

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۵ فروری ۱۹۹۸ء، شوال ۱۴۱۸ عدد ۲

ترتیب

○ اشارات
دستور میں ترمیم یا دستور کی قلب ماہیت؟ خورشید احمد ۳
○ حکمت مودودیؒ
اسلام کا انداز حکمرانی ۱۷
○ فہم قرآن
قیادت کے تقاضے — سید قطب شہیدؒ ۲۳
○ تزکیہ و تربیت
عزت و ذلت کا مفہوم — شیخ محمد غزالی / محمد فاروق خٹک ۳۱
○ اسلام اور مغرب
مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی: ہمدردی یا سازش — ڈاکٹر تسنیم ابراہیم / محمد ظہیرالدین بھٹی ۳۵
○ بحث و نظر
کارل مارکس کی انسان دوستی — عبدالقدیر سلیم، سلیم منصور خالد ۴۹
○ اخبار امت
الجزائر: ہاں یہ قتل ہم نے کیے! — مسلم سجاد ۶۳
○ رسائل و مسائل ۶۷
○ کتاب نما ۷۵
○ مدیر کے نام ۸۳

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰
فون: ۷۸۴۴۶۰۵
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۴۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے
بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے
مشرق وسطیٰ، یورپ
مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

خود مختار اور مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں بھی بہت سی دجالی قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی کبھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مارتے اور جلاتے ہیں' "تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ابراہیمؑ سے مناظرہ کیا تھا اس بنا پر کہ اللہ نے اس کو سلطنت عطا فرمائی تھی' جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے' اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں" (البقرہ ۲: ۲۵۸)۔ ان کے ہاتھوں میں بھی اللہ کے حکم سے اس کے کچھ بندوں کا رزق ہوتا ہے۔ ان کے پاس بھی ایک بہشت نما مقام ہوتا ہے جو کم ہمتوں کی جنت ہوتی ہے' جس میں ہر قسم کا عیش و لطف ہوتا ہے۔ وہ جن سے خوش ہوتے ہیں ان کو اس "جنت شداد" میں داخل کر دیتے ہیں۔ کسی کو اپنا ندیم بنا لیتے ہیں' کسی کو اپنا وزیر' کسی کو زر و جواہر سے مالا مال کر دیتے ہیں اور کسی کو کوئی منصب خطاب اور عہدہ دے کر نہال کر دیتے ہیں۔ جن سے وہ ناخوش ہوتے ہیں' ان کے لیے دنیا کو جہنم بنا دیتے ہیں اور زندگی کو عذاب جان۔ سولی پر چڑھا دیتے ہیں یا جیل خانے میں ڈال دیتے ہیں' جہاں وہ گھٹ گھٹ کر مرجاتا ہے۔ کسی کو وہ جہنم دکھا کر ڈراتے ہیں اور کسی کو وہ اپنی خوشنودی کے "سبز باغ" دکھا کر پھسلاتے ہیں۔ جو اس طرح ان کا تابع نہیں ہوتا' وہ اس طرح ان کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ ان کی قہر کی نگاہ میں بھی جادو ہے کہ جس طرف اٹھتی ہے' بڑے بڑے شیر' لومڑی بن جاتے ہیں۔ ان کی مہر کی نگاہ میں بھی جادو ہے کہ جس پر پڑتی ہے' اپنا دین و ایمان نذر کر دیتا ہے۔

ان "دجالوں" کے شعبدوں سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو سلطنتوں اور بادشاہوں کی پرواہ نہ کریں' جو خزانوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں' جو تخت و تاج' منصب و اعزاز کو پاؤں سے ٹھکرا دیں۔ اس ہمت و ایثار کی پوری مثال اصحاب کہف تھے' جنھوں نے کسی قیمت پر اپنے ایمان کا سودا نہیں کیا۔ اس کے لیے دنیا کی کوئی رشوت قبول نہیں کی اور کسی جال میں ان کا پاؤں نہیں الجھا۔ ان کو اپنے عقیدے سے پھیرنے کے لیے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لیے بادشاہ وقت نے کیا کیا ترکیبیں نہ کی ہوں گی؟ ان کو ڈرایا بھی ہو گا اور پھسلایا بھی ہو گا' جیل خانے کے دروازے بھی کھول کر دکھائے ہوں گے اور اپنی بہشت بریں کے پردے بھی اٹھا کر شوق دلایا ہو گا' ان کو سولی اور پھانسی کی دھمکی بھی دی ہو گی اور عہدہ و جاگیر کا لالچ بھی دیا ہو گا' لیکن کوئی افسوں ان پر کارگر نہ ہوا اور وہ یہی کہتے رہے: "ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے' ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز پکارنے والے نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہو گی" (الکہف ۱۸: ۱۴)۔ مسلمانوں کو اس دجال اکبر کے علاوہ جو احادیث کی پیش گوئیوں کے مطابق قیامت کے قریب ظاہر ہو گا بے شمار دجالوں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ یہ دجال مختلف بھیس میں آئیں گے اور نئے نئے شعبدے دکھائیں گے۔

(مولانا ابوالحسن علی ندوی' سورۂ کہف اور فتنہ دجال' ترجمان القرآن جلد ۱۱' عدد ۶' ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ' فروری ۱۹۳۸ء)

۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دستور میں ترمیم یا دستور کی قلب ماہیت؟

خورشید احمد

انسانی معاشرے کے استحکام اور ترقی کے لیے جہاں مخلص، نیک اور باصلاحیت قیادت ضروری ہے وہیں قانون کی حکمرانی اور بنیادی اداروں کا تحفظ اور استقلال بھی ضروری ہے۔ افراد فانی ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ادارے اگر مستحکم ہوں تو قیادت کی تبدیلی کے باوجود نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ جہاں ادارے کمزور ہوں اور سارا انحصار فانی انسانوں پر ہو، وہ نظام مٹی کے گھروندے کے مانند ہوتا ہے جو افراد کی تبدیلی سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ ناقابل فراموش سبق ہے کہ اصل استحکام اور ترقی اداروں کے استحکام اور احترام سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے بقا اور استحکام کے لیے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ **علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین** (تم پر لازم ہے کہ میری سنت کی اور خلفاے راشدین کی سنت کی پیروی کرو) سے عبارت ہے، اور یہ ہدایت اور اداروں کا تسلسل اور تواتر ہی ہے جس نے اس امت کو تاریخ کے سارے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کی۔

آج پاکستان جس بحران کا شکار ہے اس کا ایک بڑا ہی اہم پہلو اداروں کے استحکام سے غفلت اور اغماض ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس بدنصیب قوم کی سیاسی قیادت تمام ہی بنیادی اداروں کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے پر تلی ہوئی ہے اور ارباب اقتدار کا واضح ہدف چند ہاتھوں میں اختیارات کا مکمل ارتکاز نظر آ رہا ہے جو سیدھا سیدھا تباہی کا راستہ ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اداروں کی تباہی کو روکا جائے اور اختیارات کی تقسیم میں وہ توازن پیدا کیا جائے جو کسی بھی سیاسی اور اجتماعی نظام کے کامیابی سے چلنے اور قوم کو آمریت اور فسطائیت سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ ایک جمہوری اور شورائی نظام اور آمرانہ اور فسطائی نظام کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ جمہوری نظام میں دستور، قانون اور ادارے بالادست ہوتے ہیں جبکہ آمرانہ نظام دستور، قانون اور اداروں پر عملاً فرد واحد یا ایک گروہ کی مطلق العنانی مسلط کرتا ہے، خواہ بظاہر بڑی بڑی

شاندار عمارتوں پر پارلیمنٹ' عدالت اور صحافت کے پرچم لہرا رہے ہوں۔ اس وقت ملک و قوم ایک نظر فریب جمہوری تماشے کے علی الرغم اسی نوعیت کے خطرات سے دوچار ہے اور یہ وقت ہے کہ دستور اور جمہوری اداروں کے تحفظ کے لیے ہر سطح پر موثر جدوجہد کی جائے تاکہ ملک مطلق العنانی اور فسطائیت سے محفوظ رہ سکے اور ریاست کے مختلف اداروں کے درمیان صحت مند توازن رونما ہو سکے جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہو۔ عدالت اور صدارت پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد حکومت کے سربراہ اپنے اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ اب دستور کی تبدیلی' بلکہ قلب ماہیت (metamorphosis) کے لیے کوئی پیکج تیار کیا جا رہا ہے۔ دستور کی تیرھویں اور چودھویں ترمیم سے اختیارات کا جو ارتکاز واقع ہوا ہے وہ بھی کافی نہیں سمجھا جا رہا ہے اور باوثوق اطلاعات کا ماحصل یہ ہے کہ ۱۹۷۳ کے دستور کی بحالی کے نام پر ایسی بنیادی تبدیلیاں لانے کی تیاری ہے جو ملک کے پارلیمانی نظام کو مکمل طور پر وزیر اعظمی نظام (Prime Ministerial System) میں تبدیل کر دیں گی۔ وزیراعظم صاحب کا ارشاد ہے: "میرے منصوبے موجودہ نظام میں فٹ نہیں ہوتے" (جنگ لاہور' ۴ جنوری ۹۸)۔ رپورٹوں کے مطابق وفاقی کابینہ سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم نے فرمایا ہے کہ موجودہ حکومت کو عوام کی طرف سے دیا گیا بھاری مینڈیٹ اس بات کا متقاضی ہے کہ موجودہ نظام اور حکومتی طریق کار میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں لائی جائیں۔ اس سلسلے میں قانون اور آئین میں موجودہ تمام ابہام اور پیچیدگیوں کو آئینی ترامیم کے ذریعے دور کر دیا جائے گا۔ (جنگ' ۱۳' ۱۸ جنوری ۹۸)

آئینی ترامیم کا رخ کس طرف ہو گا؟ اس سلسلے میں جنگ اور دی نیوز (۱۲ جنوری ۹۷) کی اطلاع یہ ہے کہ صدر مملکت کے اختیارات کو مزید کم کیا جا رہا ہے۔ ججوں کے تقرر کے لیے چیف جسٹس کے مشورے کی شرط کو ختم کیا جا رہا ہے' چیف الیکشن کمشنر' آڈیٹر جنرل اور پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کے تقرر کا اختیار بھی وزیراعظم کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔ دستور میں بشمول دفعات ۷۵' ۹۰' ۱۶۸' ۲۱۳' ۲۶۰ بنیادی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور یہ سب پارلیمنٹ کی بالادستی کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ وائس آف امریکہ نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان دستوری ترامیم کے نتیجے میں: "صدر کے اختیارات مزید کم ہو جائیں گے اور نواز شریف ڈکٹیٹر بن کر ابھریں گے"۔ (جسارت' ۴ جنوری ۹۸)

جس رخ پر موجودہ حکومت بگ ٹٹ چل پڑی ہے وہ بڑا خطرناک ہے اور اس رجحان کا بروقت نوٹس اور اس کے خلاف موثر مزاحمت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

یہ ایک عظیم سانحہ ہے کہ ہمارے ملک میں دستوری ترمیم کو طاقت کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ دستور

وہ مقدس اور اہم ترین دستاویز ہوتا ہے جس پر کسی ملک کے پورے نظام کا انحصار ہو اور جو توازن اختیارات کا ضامن ہو۔ یہ پوری قوم اور تاریخ کی امانت ہوتا ہے اور کسی بھی فرد یا ادارے کو ذاتی مقاصد یا وقتی مصالح کی بنا پر اسے بازیچہ اطفال بنانے کا حق نہیں۔ دستور کسی ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ نسلوں اور صدیوں کے لیے بنایا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ترمیم اور تبدیلی کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے لیکن یہ ترمیم اور تبدیلی بھی دستور کے مقاصد اور قوم کی تاریخی امنگوں کے تابع اور ان حدود کے اندر ہونی چاہیے جو دستور کی ترمیم اور تعبیر کے لیے مقرر اور معروف ہیں، ورنہ قانون کی حکمرانی ایک مذاق بن جائے گی اور ادارے درہم برہم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور سازی اور عام قانون سازی کو دو الگ الگ کام قرار دیا گیا ہے۔ دستور سازی کی ذمہ داری اس ادارے کو دی جاتی ہے جسے قوم نے خاص طور پر اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔ عام قانون ساز ادارے (Parliaments) دستور کے تحت وجود میں آتے ہیں اور اس کے ارکان، نیز انتظامیہ اور عدلیہ، دستور کی حفاظت اور اس کی تنفیذ کا حلف اٹھاتے ہیں۔ انھیں دستور میں ترمیم کے محدود اختیارات ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن دستور کی تنسیخ یا اس کی قلب ماہیت کا اختیار حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دستوری قانون (Constitutional Law) میں مندرجہ ذیل دو اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ بالعموم دستوری ترمیم عام اکثریت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے خصوصی شرائط عائد کی جاتی ہیں، مثلاً پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت، یا وفاقی نظام میں پارلیمنٹ اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں سے ایک بڑی تعداد کی تائید (جیسا کہ امریکہ، بھارت اور دوسرے جمہوری ممالک میں ہے) یا پارلیمنٹ کی تائید کے علاوہ ریفرنڈم وغیرہ۔ اس طرح دستور کو دوام بھی حاصل ہوتا ہے اور تبدیلی کا امکان بھی باقی رہتا ہے۔

دوسرا اصول اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے اور اس کے ذریعے دستور میں ترمیم اور دستور کے بنیادی ڈھانچے اور تزویراتی نظام میں تبدیلی میں فرق کیا گیا ہے۔ Amendment سے مراد جزوی تبدیلی، کسی غلطی یا سہو کی اصلاح اور بنیادی ڈھانچا اور تزویراتی نظام کے مطابق کمی یا اضافہ اور اس کے فطری ارتقائی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے خلاف یا اس سے متصادم کسی تبدیلی کو جائز ترمیم (legitimate amendment) نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بڑا ہی بنیادی مسئلہ ہے اور اس کی تفہیم اور احترام بے حد ضروری ہے اس لیے ہم اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک ترمیم (amendment) کے لغوی مفہوم کا تعلق ہے، وہ جزوی تبدیلی ہے، بنیادی تبدیلی نہیں۔ The Oxford Reference Dictionary 1986 کے مطابق amend کے معنی ہیں:

To correct an error in; to make minor alterations in. (p 23)

اسی طرح Chambers 20th Century Dictionary کے مطابق اس کا مفہوم:

"To free from fault or error; to correct: to improve; to alter in detail with a view to improvement as a bill before parliament; to rectify; to cure; to mend".

Webster Third New International Dictionary کے مطابق ترمیم (amend) کا مقصد کسی غلطی یا کمی کو دور کرنا ہے اور اصلاً یہ لفظ اس چیز یا عمل کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کے ذریعے ایک پودے کو زمین میں پرورش پانے میں سہولت مل سکے۔ گویا پودے کی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے نمو کے عمل کو متاثر کرنے والی چیز کو دور کرنا یا تبدیل کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ دستوری قانون کے ماہرین اور اعلیٰ عدالتوں نے "ترمیم" کو تنسیخ یا بنیادی تبدیلیوں کے ہم معنی تصور نہیں کیا بلکہ ایسی تبدیلی جو دستور کے مقاصد اور بنیادی ڈھانچے کے مطابق ہے' اور جو اس سے متصادم ہے' ان میں فرق کیا ہے' اور ترمیم کے دائرے کو صرف اول الذکر تک محدود کر دیا ہے۔ اگر بنیادی ڈھانچے یا ریاست کے مقاصد میں تبدیلی کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے عوام سے نئے مینڈیٹ کو ضروری سمجھا ہے۔ دنیا کے کچھ دساتیر میں تو چند دفعات کو ناقابل تغیر قرار دے دیا جاتا ہے (جیسا کہ ایران میں ہے) لیکن باقی مقامات پر بھی کسی خاص وقت کی پارلیمنٹ کو یہ اختیار دینے میں تامل کیا گیا ہے کہ وہ دستور میں جب چاہے اور جو چاہے تبدیلی کرا دے۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کی دستوری تاریخ پر ایک نظر ڈالنا مفید ہو گا۔

بھارت میں یہ مسئلہ ۱۹۷۳ میں ابھر کر سامنے آیا۔ بھارت کے دستور میں دفعہ ۳۶۸ ترمیم دستور کے بارے میں ہے' جس کی رو سے دستور میں ترمیم کے لیے لوک سبھا اور راجیا سبھا دونوں کی دو تہائی اکثریت ضروری ہے اور کچھ معاملات میں اس کے ساتھ کم از کم نصف صوبائی ریاستوں کی مقننہ کی حمایت ضروری ہے۔ بنیادی حقوق کے سلسلے میں ایک مقدمے میں' جسے Kesavananda Vs. Kerala کے نام سے پکارا جاتا ہے' (AIR 1973 SC 1461) بھارت کی سپریم کورٹ نے یہ اصول طے کیا کہ پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق یا دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کا حق نہیں' اس لیے کہ ان کا تعلق ریاست کے مقصد اور اس کے وجود کے جواز سے ہے۔ اس لیے ہر ایسی ترمیم جو ان کو متاثر کرے غیر قانونی متصور ہو گی۔ اندرا گاندھی بمقابلہ راج نرائن (AIR 1973 SC 2299) میں سپریم کورٹ نے پھر اس اصول کی توثیق کی اور یہ دستوری پوزیشن طے کی کہ دفعہ ۳۶۸ پارلیمنٹ کو ترمیم دستور کا مطلق حق نہیں دیتی بلکہ اس حق کو صرف جزوی تبدیلی تک محدود کرتی ہے۔ مطلق' بنیادی یا انقلابی تبدیلی کا اختیار کسی پارلیمنٹ کو حاصل نہیں جو دراصل دستور ساز ادارہ نہیں بلکہ دستور کے تحت وجود میں آنے والا ایک ادارہ ہے۔ وہ نہ دستور کی تنسیخ کر سکتا ہے اور نہ

اس کے بنیادی ڈھانچے کو تبدیل کر سکتا ہے۔ البتہ اس ڈھانچے کے مطابق جزوی تبدیلی کا حق اسے حاصل ہے۔ اس فیصلے کو غیر موثر بنانے کے لیے بھارتی وزیر اعظم (اندرا گاندھی) نے دستور میں بیالیسویں ترمیم کر ڈالی جس کے ذریعے آرٹیکل ۳۶۸ میں دو شقوں ۴ اور ۵ کا اضافہ کیا گیا۔

دفعہ ۴ کے ذریعے قرار دیا گیا کہ اس آرٹیکل کے تحت جو ترمیم بھی کی جائے گی اسے کسی بھی بنیاد پر کسی بھی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جا سکے گا۔ دفعہ ۵ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

5- For removal of doubts it is hereby declared that there shall be no limitation on the constitutional powers of Parliament to amend by way of addition, variation or repeal the provisions of the constitution under this article.

ترجمہ: شبہات دور کرنے کے لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے اس آرٹیکل کے تحت، دستور کی دفعات میں اضافے، تبدیلی یا تنسیخ کے ذریعے ترمیم کرنے کے پارلیمنٹ کے دستوری اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہو گی۔

بھارت کی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۰ میں منروا ملز کیس (Minerva Mills Case AIR 1980 SC 1789) میں اس دستوری ترمیم کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ آرٹیکل ۳۶۸ میں اس ترمیم کا (یعنی شق ۴ اور ۵ کے اضافے) کا پارلیمنٹ کو حق نہیں تھا اس لیے اسے خلاف قانون اور غیر موثر قرار دیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کہ پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کر سکتی، قائم اور برقرار ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس فیصلے کے بعد نہ تو سپریم کورٹ پر کوئی ہلہ بولا گیا، نہ چیف جسٹس اور متعلقہ ججوں کی چھٹی کی گئی اور نہ پارلیمنٹ نے اسے اپنے حقوق پر دست درازی تصور کیا۔ سب نے سپریم کورٹ کے طے کردہ اس دستوری اصول کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور قانون کی بالادستی اور اداروں کے استحکام کا راستہ اختیار کیا۔

پاکستان میں دستور کے ساتھ جو مذاق بار بار ہوتا رہا ہے وہ ہمارے سیاسی عدم استحکام کی اصل وجہ ہے۔ جس ملک میں دستور کا حلف اٹھانے والے ہی اسے اپنی ذاتی مصلحتوں یا مفادات کی خاطر جب چاہیں پھاڑ کر پھینک دیں یا اس میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اس کا حلیہ ہی بگڑ جائے تو پھر اس ملک میں قانون اور حقوق کا کیا حشر ہو گا، گویا:

آئین چمن بندی بھی نہیں، دستور نوا سنجی بھی نہیں
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشاں کیا ہو گا؟

یہی وہ خلفشار ہے جس سے ملک و قوم کو بچانے کے لیے سپریم کورٹ نے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کے

دور میں عاصمہ جیلانی کیس میں ایک تاریخی فیصلہ دیا تھا جس کے ذریعے چیف جسٹس منیر کے ماضی کے فیصلے کو کالعدم کیا گیا اور مستقبل کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ قانون کی حکمرانی صرف دستور کے احترام ہی سے ممکن ہے، اس سے انحراف یا اس کی تنسیخ غداری کے مترادف ہے۔ بڑے محکم دلائل دینے کے بعد چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے لکھا:

"اس تجزیے کی بنیاد پر میں، فاضل چیف جسٹس کے لیے احترام کے بہترین جذبات کے ساتھ، اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے Kelson Theory کی تعبیر کرنے اور اسے اپنے سامنے پیش مقدمے کے حالات و واقعات پر منطبق کرنے میں غلطی کی۔ میری حقیر رائے میں، انھوں نے جو اصول بیان کیا ہے اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے (wholly unsustainable)۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ کہوں کہ اسے اچھا قانون قرار نہیں دیا جا سکتا"۔

چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے یہ تاریخی الفاظ بھی لکھے کہ پاکستان میں ناقابل تغیر دستوری ڈھانچا قرارداد مقاصد ہے جسے اس دستور ساز اسمبلی نے طے کیا تھا جو قیام پاکستان کے وقت دستور سازی کے لیے منتخب کی گئی تھی اور اس سے کوئی انحراف ممکن نہیں۔ انھوں نے لکھا:

"بہرصورت اگر ہمارے لیے کوئی اعلیٰ معیار (grand norm) ضروری ہے، تو مجھے اسے معلوم کرنے کے لیے مغرب کے قانونی ماہروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اپنا اعلیٰ معیار، ہمارے اپنے عقیدے کا حصہ ہے، یعنی یہ کہ پوری کائنات پر قانونی حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور لوگ جو اختیار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہیں، ایک مقدس امانت ہے۔ یہ ناقابل تغیر و تبدل اصول قرارداد مقاصد میں، جسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو منظور کیا تھا، واضح طور پر تسلیم کیا گیا تھا"۔

جسٹس یعقوب علی نے چیف جسٹس کے فیصلے کی تائید کی مگر اپنے جداگانہ فیصلے میں نہ صرف یہ کہ قرارداد مقاصد کی اس اساسی حیثیت کی تائید و توثیق کی بلکہ جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خاں دونوں کے دستور کی تنسیخ کے عمل کو ایک غیر قانونی اور باغیانہ فعل قرار دیا جسے کبھی سند جواز نہیں دی جا سکتی، اور ہر دور کے آمروں کو متنبہ کیا کہ دستور میں اس نوعیت کی دراندازیوں کو کبھی بھی "جائز قانون سازی" تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے لکھا:

"ہو سکتا ہے کہ ریاست کے جبریہ اقتدار کی وجہ سے، عوام اور عدالتیں عارضی طور پر خاموش ہو جائیں لیکن یہ یقینی طور پر قرار دیا جانا چاہیے کہ یہ غاصب جو حکم دیں گے وہ غیر قانونی ہوگا اور عدالتیں ان کے قواعد کو تسلیم نہیں کریں گی اور نہ ان کو قانونی قرار دے کر ان کے مطابق عمل کریں گی۔ جیسے ہی

ایسا پہلا موقع آئے جب غاصب کے ہاتھ میں ریاست کا جابرانہ نظام نہ رہے، اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جانا چاہیے اور مناسب سزا دی جانی چاہیے۔ صرف یہی چیز بعد کے مہم جوؤں کو روکنے کا باعث بنے گی"۔

بدقسمتی سے طالع آزما قانون کی گرفت سے بچے رہے جس کی وجہ سے بگاڑ کی یہ راہیں مسدود نہ ہو سکیں۔ لیکن عدلیہ کے مثبت کردار سے سیاہ و سپید اور جائز اور ناجائز ایک دوسرے سے ممتاز و ممیز ہو گئے اور مستقبل کے خطرات اور ان کے مقابلے کے نشان راہ واضح ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے دستور کی تنسیخ کی جگہ اس کی معطلی (abeyance) کا راستہ اختیار کیا اور عدالتوں نے بھی اسے دستوری انحراف (constitutional deviation) قرار دیا۔ جب عارضی دستوری حکم نامہ (Provisional Constitutional Order) لاگو کیا گیا تو اس وقت کے چیف جسٹس اور ججوں کی ایک تعداد نے حلف لینے سے انکار کر دیا اور مارشل لا کے نظام میں ایسی دراڑیں پڑ گئیں کہ بالآخر ۱۹۸۵ میں جمہوریت بحال ہوئی۔

نصرت بھٹو کیس میں بھی چیف جسٹس نے قرارداد مقاصد کو ملک کا بنیادی قانون قرار دیا اور اس کے بعد بھی اعلیٰ عدالتوں نے اس قرارداد اور اس کے اصولوں کو دستوری بنیادی ڈھانچے کے طور پر تسلیم کیا۔ نیز آہستہ آہستہ ہماری عدالتوں نے بھی دستور کے بنیادی ڈھانچے کے اصول کی توثیق کی جو بالآخر اچکزئی کیس میں سپریم کورٹ کے فل بنچ فیصلے کی شکل میں دستور کا حصہ بن گیا۔ ضرورت ہے کہ اس فیصلے کو بغور پڑھا جائے اور ملک کے سیاستدان، وکلا اور ارکان پارلیمنٹ اس کی روشنی میں دستوری معاملات طے کرنے کی کوشش کریں۔

"یہ امر غیر متنازع ہے کہ تینوں دساتیر میں قرارداد مقاصد مشترک ہے اور اس کو تینوں دساتیر میں، بشمول ۱۹۷۳ کا دستور، بطور مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ کے دستور کی بحالی ان تمام شبہات کو دور کرتی ہے جو پی سی او (PCO) کے نفاذ سے پیدا ہو سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا ارادہ دستور کو، صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن قائم کرنے کے لیے ترامیم کے ساتھ بحال کرنے کا تھا، اور دستور میں اسلامی دفعات شامل کرنا بھی تھا جس کے لیے قرارداد مقاصد میں واضح طور پر بنیاد فراہم کر دی گئی تھی---

اس لیے ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ آٹھویں ترمیم، بشمول دفعہ ۵۸ (۲) ب دستور کے مستقل فیچر کے طور پر قائم رہنے کے لیے ہے۔ صدر کے لیے یہ راستہ کھلا ہے کہ دفعہ ۲۳۹ کے تحت دستوری ترمیم کے ذریعے آٹھویں ترمیم کی کسی دفعہ میں ترمیم کرے، جب تک کہ قرارداد مقاصد میں جو اب ۱۹۷۳ کے دستور کا مقدمہ اور دفعہ ۲ کے تحت دستور کا قابل عمل (substantive) حصہ ہے، درج

وفاقیت، پارلیمانی جمہوریت اور اسلامی دفعات کے اساسی اصولوں کو نہ چھیڑا جائے"۔

سپریم کورٹ کے فل بنچ کا یہ فیصلہ دستور کے بنیادی ڈھانچے اور صرف اس کے اندر ترمیم کے اصول کو بالکل صاف الفاظ میں طے کر دیتا ہے۔ اس لیے ملک کی تمام دینی اور سیاسی قوتوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ انھیں صرف دستوری ترامیم کے ایک ایسے پیکج پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو قرارداد مقاصد کے مطابق دستور کے بنیادی ڈھانچے یعنی اسلام، پارلیمانی جمہوریت، وفاقیت، حقوق انسانی کے تحفظ، عدلیہ کی آزادی، توازن اختیارات اور قانون کی بالادستی کو مستحکم کرنے والا ہو اور ہر ایسی ترمیم کی ڈٹ کر مزاحمت کی جائے جو کسی بھی رنگ میں ارتکاز اختیارات اور ایک فرد، گروہ یا ادارہ کی مطلق العنانی کی راہ ہموار کرنے والی ہو۔

چونکہ نئے دستوری پیکج کا رشتہ عوامی مینڈیٹ سے جوڑا جا رہا ہے اس لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ عوامی مینڈیٹ کی صحیح حقیقت کو بھی صاف الفاظ میں متعین کر لیا جائے۔ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۷ تک پانچ انتخاب ہوئے ہیں لیکن یہ سب ۱۹۷۳ کے دستور کے تحت قانون ساز اداروں کے انتخاب تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے نہیں تھا۔ پھر ۱۹۹۷ کے انتخابات تو غیر معمولی حالات میں ہوئے جن کا ملک کی عظیم اکثریت نے انتخابی بائیکاٹ کیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک تہائی ووٹرز نے انتخابات میں شرکت کی حالانکہ تمام ملکی اور غیر ملکی آزاد مبصرین کے مطابق اصل شرکت بمشکل بیس سے پچیس فیصد ووٹرز نے کی۔ کامیاب ہونے والی جماعت کو کل ووٹرز کے زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ فی صد کی تائید حاصل تھی۔ لیکن اگر ہم تعداد کے مسئلے کو نظرانداز کر دیں اور توجہ اصل مسائل پر مرکوز کریں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ نے جو منشور ۱۹۹۷ کے انتخابات میں قوم کے سامنے پیش کیا اس میں بلاواسطہ دستوری ترامیم کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ پورے منشور میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں دستور یا اس کے کسی حصے کے بارے عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا اور اس میں ترمیم کے لیے کوئی حق عوام سے حاصل کیا گیا ہو۔ ہم نے میاں نواز شریف صاحب کے اس منشور کا ان کے تعارف سمیت بغور مطالعہ کیا ہے اور جو شخص بھی اس کا مطالعہ اور تجزیہ کرے گا ہماری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ اس میں بنیادی یا انقلابی دستوری ترامیم کے مسئلے سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ جن امور کو دستوری ترمیم کا معاملہ قرار دیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہیں:

۱۔ آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی محدود کرنا (گو عملاً اس حکومت کے پہلے دس مہینوں میں ۱۸ آرڈیننس جاری ہوئے ہیں)۔

۲۔ سیاسی وفاداری میں تبدیلی اور ہارس ٹریڈنگ کے خاتمے کے لیے آئین میں ترمیم (جو چودھویں ترمیم کی شکل میں کی گئی ہے جس کا مقصد صحیح مگر انداز قابل تنقید ہے کہ اس طرح پارٹی سربراہ کی مطلق العنانی قائم ہو جائے گی)۔

۳۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو معاشرے کے مختلف طبقات کا بھرپور نمائندہ بنانے کے لیے پارلیمنٹ کی نشستوں میں اضافہ' خواتین اور مختلف پیشوں سے ماہرین کو متناسب نمائندگی کے تحت پارلیمنٹ میں نمائندگی دینا۔

۴۔ منتخب نمائندوں کے اثاثوں کا سرعام اعلان' صوابدیدی اختیارات کا خاتمہ یا انھیں "انتہائی محدود" کرنا' وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج کی حوصلہ شکنی اور وزیروں اور مشیروں کی تعداد کی حد مقرر کرنا' نیز نجی کاروبار میں مصروف منتخب نمائندوں پر منصب کی بنیاد پر مفادات حاصل کرنے پر قانون (conflict of interest legislation) کے ذریعے واضح پابندی (ان میں سے کسی پر عمل نہیں ہوا بلکہ وزیروں اور مشیروں کی فوج میں اضافہ ہوا ہے)۔

۵۔ جج صاحبان کی تعداد میں اضافہ (جس کا حشر سپریم کورٹ میں طے شدہ تعداد کو بھی کم کرنے کی کشمکش میں دیکھا جا سکتا ہے)۔

۶۔ احتساب کے عمل کو مستحکم کرنا' ہر سول ملازم اور منتخب نمائندے پر لازم ہو گا کہ وہ باقاعدگی سے اپنے مالی مفادات اور اثاثوں کا اظہار کرے اور یہ ریکارڈ عوامی معائنے کے لیے کھلا رکھا جائے نیز عوامی نمائندوں اور ریاستی عہدہ داروں کے خلاف بدعنوانی کی عوامی شکایات کی تفتیش کے لیے ایک خود مختار اور بااختیار ادارہ موجود رہے۔ یہ تفتیش اور استغاثے کے لیے اپنا علیحدہ انتظام رکھے (جس کا حشر وزیراعظم کے دفتر میں احتساب سیل کے قیام کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے)۔

پورے منشور میں یہ چھ امور ایسے ہیں جنھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ دستوری ترمیم سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ ان میں نہ آٹھویں ترمیم کا ذکر ہے' نہ صدر کے اختیارات کا اور نہ عدلیہ کے دستوری حقوق و فرائض کی تنظیم نو کا۔۔۔ اگر آپ کا منشور ہی ان تمام امور سے خالی تھا تو پھر آپ کو مینڈیٹ کیسے حاصل ہو گیا؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دستور میں دو ترامیم موجودہ حکومت نے پارلیمنٹ سے جس انداز میں کروائی ہیں وہ اس حکومت کے انداز حکمرانی کی غماز اور اس کے طریق واردات کی مظہر ہیں۔ یہ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے چہرے پر ایک

بدنما داغ ہیں۔ جس آٹھویں ترمیم پر اتنا شور و غوغا ہے اس پر قومی اسمبلی نے پورے چالیس دن اور سینیٹ نے سات دن بحث کی۔ دلیل اور سیاسی دباؤ کے ذریعے اصل مسودے میں پندرہ کے قریب ترامیم کرائیں جس کے ذریعے نیشنل سیکورٹی کونسل کے ادارے کو ختم کیا گیا' صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں کچھ توازن پیدا کیا گیا' اسمبلی کی تحلیل کو جوڈیشل ریویو کے لیے کھولا گیا' وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کے انتخاب کے کام کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی طرف منتقل کیا گیا اور نویں دستوری ترمیم کے لیے حکومت سے حتمی وعدہ لیا گیا جو پورا نہ ہوا۔ اس کے برعکس ذرا غور کریں کہ تیرھویں اور چودھویں ترمیم کا ڈراما کس طرح اسٹیج کیا گیا۔

پانچ پانچ گھنٹے میں اتنی بنیادی ترامیم' کسی بحث کے بغیر' تمام قواعد و ضوابط معطل کر کے منظور کرالی گئیں۔ یہ قانون سازی نہیں دستور کے ساتھ مذاق ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی پارلیمنٹوں کی تاریخ میں ایسی سرعت اور سہل انگاری سے دستوری ترامیم کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

ہم نے یہ دونوں مثالیں اس لیے دی ہیں کہ ہمیں خطرہ ہے کہ آیندہ بھی دستوری ترامیم کے لیے ایسے ہی ڈرامے نہ اسٹیج کیے جائیں۔ اس کی موثر مزاحمت ہونی چاہیے۔ دستوری پیکج کی تیاری کا کام اس طرح کرنا' دستور' قانون' اخلاق اور جمہوری آداب کے منافی ہے۔ اگر دستور میں کچھ کمزوریاں ہیں یا دستور کے ڈھانچے کے مزید موثر بنانے کے لیے کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے تو ان پر کھل کر علمی اور عوامی سطح پر بحث ہونی چاہیے۔ دستوری تجاویز مرتب کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے ارکان اور دوسرے اہل علم و تجربہ پر مشتمل کمیشن بننا چاہیے جو تمام عوامی اور علمی حلقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کرے۔ ان پر کھلی بحث پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر ہونی چاہیے تاکہ دن کی پوری روشنی میں' اور زیادہ سے زیادہ قومی اتفاق رائے پیدا کر کے' دستور میں ترامیم ہوں۔ ان کے ایک ایک لفظ پر غوروخوض کے بعد انھیں کتاب آئین میں مرقوم کیا جائے۔ اس سے ہٹ کر جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ فساد اور بگاڑ کا طریقہ ہے اور اس سے کبھی خیر رونما نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر ایک اور اصولی اور بنیادی بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم یہ بات ایک قومی اور تاریخی امانت کے طور پر پیش کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ وزیراعظم صاحب کا ذہنی میلان اپنی ذات میں اختیارات کے زیادہ سے زیادہ ارتکاز کی طرف ہے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا رخ اسی سمت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۱ میں جس دستوری ترمیم کا مسودہ بارھویں ترمیم کے طور پر تیار ہوا تھا اس کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مجوزہ دستوری ترمیم میں غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خصوصی ٹربونل

بنانے اور وزیراعظم کے لیے دستور کی کسی بھی شق کو اپنی صوابدید پر معطل کرنے کا اختیار حاصل کرنے کی کوشش کی گئی--- یعنی پارلیمنٹ، سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت، بنیادی حقوق غرض دستور کی کسی بھی شق کو وقتی طور پر معطل کرنے کا حق وزیراعظم کو دینا پیش نظر تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ مسودہ ہائی کورٹ کے ایک "سابق جج کے مشورے بلکہ انھی کی ڈرافٹنگ سے تیار ہوا تھا اور اسے کابینہ نے بھی منظور کر لیا تھا۔ جب محترم قاضی حسین احمد اور میں نے اس کی مخالفت کی تو وزیراعظم صاحب کو سخت دھچکا لگا۔ اس وقت کے صدر غلام اسحٰق صاحب نے بھی اس پر سخت تنقید کی۔ جب مخالفت کھل کر سامنے آئی تو کابینہ کے ارکان پریشان ہوئے اور کم از کم دو ارکان کابینہ (یعنی حامد ناصر چٹھہ اور جنرل مجید ملک) نے برملا کہا کہ ہم نے کابینہ میں پورے غور و تجزیے کے بغیر ہی اس تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ سینیٹ کے چیئرمین وسیم سجاد صاحب نے بھی اس مجوزہ ترمیم کو ختم کرنے اور اس کی جگہ ایک ایسی ترمیم کا مسودہ تیار کرنے میں بڑا مثبت کردار ادا کیا جو صرف لاقانونیت کے مقابلے کے لیے صرف دو سال کے لیے ٹریبونل بنانے پر مشتمل تھی۔

اس واقعے کے تین پہلو ایسے ہیں جن کے بارے وارننگ اور پیش بندی ضروری ہے:

اول: جناب نواز شریف کا یہ رجحان کہ سارے اختیارات ان کے ہاتھوں میں مرکوز ہوں، یہ جمہوریت اور شورائیت کی ضد اور آمریت کی راہ ہموار کرنے والی چیز ہے۔

دوم: کابینہ کا بڑے اہم معاملات پر سے بھی اس روا روی میں گزر جانا اور قانون سازی کے لیے جس احتیاط، مشورے اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہے، اس کا اہتمام نہ کرنا۔

سوم: ہمارے کچھ سابق ججوں کا رویہ جو ایک مدت تک انصاف کی کرسی پر بیٹھنے اور دستور اور قانون کے محافظ ہونے کے باوجود جب سیاست میں آتے ہیں تو ایسے ایسے گل کھلاتے ہیں کہ

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

اس واقعے کے بارے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ حرف بہ حرف مبنی بر حقیقت ہے اور اس نازک لمحے کو ریکارڈ پر لانے کا مقصد کسی کو مطعون کرنا نہیں بلکہ مستقبل کے بارے میں قوم کو متنبہ کرنا ہے۔

آخر میں ہم قوم اور اس کے تمام ذمہ دار افراد سے یہ اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ ملک کو تصادم اور دستوری خلفشار سے بچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ پارلیمنٹ کے ارکان سے بھی ربط قائم کریں اور انھیں خدا کا خوف دلائیں اور یاد دلائیں کہ انھیں پھر عوام کے سامنے آنا ہو گا۔ نیز علما، قانون دان حضرات اور سیاسی قائدین سے گزارش ہے کہ دستور کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور بجائے اس کے کہ حکومت کوئی دستوری پیکج لائے، قوم کے سوچنے سمجھنے والے عناصر مثبت طور پر دستوری ترامیم کا ایک صحت

مند پیکج تیار کریں جسے قوم کے دل کی آواز قرار دیا جاسکے اور جس کے حق میں اتنی رائے عامہ منظم کی جا سکے کہ اس سے ہٹ کر کسی اور صورت میں دستور میں ترامیم ممکن نہ رہیں۔ جس طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے سرکردہ علما نے ۱۹۵۲ میں دستوری بحث کو ایک ایسا رخ دے دیا تھا کہ آیندہ کی دستور سازی اس سے منحرف نہ ہو سکی، اس طرح اس وقت بھی ضرورت ہے دستور کے اصل ڈھانچے کو قرارداد مقاصد کی روشنی میں مستحکم کرنے اور مزید ترقی دینے کے لیے جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ان کو واضح کیا جائے، اختیارات کی تقسیم میں مناسب توازن قائم کیا جائے اور حکومت اور پارلیمنٹ کو ایک قومی اتفاق رائے کے تحت انھیں منظور کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جن بنیادی اصلاحات کی ضرورت ہے ان کا ایک مجمل خاکہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱- دستور میں سب سے اہم ترمیم شریعت کی بالادستی اور اسے ملک کا بالا ترین قانون (supreme law) تسلیم کرانے کے لیے ہونی چاہیے۔ اس کا عہد اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنے ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ کے منشور میں کیا تھا۔ اس سے پہلے قومی اسمبلی اور سینیٹ نے نویں دستوری ترمیم کی شکل میں اس کا وعدہ کیا تھا اور سینیٹ نے یہ ترمیم متفقہ طور پر منظور بھی کر لی تھی۔ اور خود نواز شریف صاحب نے ۱۹۹۱ میں پارلیمنٹ کے اس مشترک اجلاس میں جو رمضان کے مبارک مہینے میں منعقد ہوا تھا، اس کا وعدہ کیا تھا اور اس پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہو گیا تھا کہ دستور کی دفعہ ۲ میں مزید ترمیم کر کے یہ اضافہ کیا جائے گا کہ شریعت اسلامی ملک کا بالاترین قانون ہو گی اور شریعت کی تعریف وہ اسلامی احکام ہوں گے جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

۲- دستور میں آرٹیکل ۴ اور ۵ بڑے بنیادی آرٹیکل اور پورے قانونی نظام کی بنیاد ہیں۔ مندرجہ بالا ترمیم (شریعت کی بالادستی) کی روشنی میں ان دونوں دفعات میں یہ ضروری ترمیم کر دی جائے یعنی:

--- دفعہ ۴ میں ملک کے تمام افراد کے اس حق کو تسلیم کیا جائے کہ ان سے شریعت اور قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا--- اور

--- دفعہ ۵ میں یہ وضاحت ہو جائے کہ شریعت کے خلاف ہر قانون، حکم، ہدایت، فیصلہ یا عمل در آمد جو کسی بھی وقت جاری ہو یا اٹھایا جائے وہ کالعدم ہو جائے گا۔

۳- دستور کے آرٹیکل ۳۱ میں مرقوم حکومتی پالیسی کے راہنما اصول کے نفاذ کے لیے ایک موثر مشینری وجود میں لائی جائے گی جو ایک متعین مدت میں ان پر مکمل عمل در آمد کو یقینی بنائے گی جس کے بعد یہ حقوق بھی باقی حقوق کی طرح نافذ العمل ہو جائیں گے۔

۴- دستور کے آرٹیکل ۴۵ اور ۲۴۸ میں جو اختیارات اور تحفظات شریعت کے منافی ہیں، وہ ختم کر

دیے جائیں گے۔

۵- وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونا جیسا کہ وزارت عظمیٰ کے حلف نامے سے واضح ہے دستور کی دفعہ ۹ میں شامل کر لیا جائے گا۔

۶- وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار وسیع کر کے تمام قوانین اور عدالت اور انتظامیہ کے ضوابط کار کو اس کے دائرہ اختیار (jurisdiction) میں لے آیا جائے گا' نیز وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس اور ججوں کا تقرر بھی مستقل ہو گا۔ انھیں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کا تحفظ اور اختیار حاصل ہو گا۔ ان کے تقرر' منتقلی' مناصب کار کی تبدیلی وغیرہ کے سلسلے کی تمام امتیازی دفعات (provisions) ختم کر دی جائیں گی اور عدلیہ کی آزادی اور انتظامیہ کے علیحدگی کے تمام اصول و قواعد وفاقی شرعی عدالت اور باقی اعلیٰ عدالتوں میں یکساں ہوں گے۔ وفاقی شرعی عدالت کو اپنے دائرے میں دست گیری (relief) کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

۷- سینیٹ کو مزید اختیارات دیے جائیں' خصوصیت سے مالی معاملات میں بحث اور مشورے کا حق' تمام بین الاقوامی معاہدات کی توثیق کا حق' چند اہم تقرریوں کی توثیق۔

۸- ریاست کے اہم اداروں بشمول بری' بحری اور فضائی سربراہوں' چیف جسٹس آف پاکستان' چیف الیکشن کمشنر' پبلک سروس کمیشن کا سربراہ اور آڈیٹر جنرل کے تقرر کے لیے واضح ضابطہ--- اور ناموں کی تجویز کے لیے ایسا نظام جو سیاسی دراندازی سے پاک اور خالص میرٹ پر مبنی ہو۔ جو تقرریاں سیاسی نوعیت کی ہوں ان کے لیے حکومت اور اپوزیشن میں مشورے کا نظام قائم کیا جائے یا سینیٹ کی متعلقہ کمیٹیوں سے منظوری لی جائے جس طرح دنیا کے جمہوری ممالک میں ہے۔

۹- عدلیہ کی انتظامیہ سے مکمل علیحدگی' عدلیہ کی آزادی اور عدلیہ سے سبک دوش ہونے والے ججوں کے لیے ایسا انتظام کہ ان سے قومی امور میں پورا پورا فائدہ تو اٹھایا جا سکے مگر منافع والے منصب (office of profit) کا لالچ باقی نہ رہے۔ نیز سپریم کورٹ کے ۲۰ مارچ کے فیصلے کے مطابق طے شدہ اصولوں کو دستوری تحفظ دیا جائے۔

۱۰- پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی مدت پر از سرنو غور مناسب ہو گا۔ اسے کم سے کم چار سال کر لیا جائے تاکہ عوامی مینڈیٹ کی جلد تجدید ہو سکے۔ نیز پارلیمنٹ کے ممبران کی تعداد بڑھانے اور تمام موثر طبقات بشمول خواتین کی نمایندگی کے لیے مناسب انتظام۔ اس سلسلے میں متناسب نمایندگی کے نظام کو مکمل یا جزوی طور پر اختیار کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

۱۱- صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن اور حکومت انتظامیہ اور پارلیمنٹ کے لیے ایسا انتظام

کہ حکومت اور پوری انتظامی مشنری پر پارلیمنٹ کی بالادستی اور گرفت موثر ہو سکے اور پارلیمنٹ عملاً حکومت اور انتظامیہ کی یرغمال (hostage) نہ بن جائے۔

۱۲۔ احتساب کے نظام کو ایک مستقل بالذات بااختیار نظام کے طور پر قائم کرنا' اسے دستوری تحفظ' مالی آزادی اور تفتیش اور استغاثے کے لیے ان کا اپنا آزاد نظام' نیز حکومت اور عوام کی تحریک پر ازخود کارروائی (suo motto) کا اختیار۔

۱۳۔ وفاقی نظام کو اس کی حقیقی اسپرٹ کے ساتھ روبہ عمل لانا۔ دستور میں موجود تقسیم اختیارات کی عملی تنفیذ اور ایک متعین مدت میں صوبوں اور لوکل باڈیز میں انتظامیہ' ٹیکسیشن' پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ اور دوسرے تمام میدانوں میں اختیارات کی حقیقی منتقلی (devolution of power)۔

۱۴۔ سود اور قرض کی معیشت سے نجات۔

۱۵۔ تعلیم' صحت' رہائش' دولت کی منصفانہ تقسیم' روزگار کے مواقع کی فراہمی اور جان' مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے شہریوں کے حقوق کے منشور (charter) کی تیاری اور ان پر دستوری ضمانت کے ساتھ عمل درآمد کا موثر نظام۔

۱۶۔ معاشی خود انحصاری کے حصول اور خسارے کی بجٹ سازی پر پابندی کے لیے دستوری اور قانونی انتظام۔

یہ وہ سولہ نکات ہیں جن کے بارے میں دستور' قانون اور پالیسی ہر سطح پر موثر کارکردگی کی ضرورت ہے۔ قرارداد مقاصد کی روشنی میں زندگی کا جو نقشہ بننا چاہیے وہ اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام امور پر توجہ دی جائے' دستور کو بھی انھی مقاصد کے لیے موثر بنایا جائے اور حکومت اور عوامی سطح پر بھی ان کے حصول کے لیے جدوجہد ہو۔ اسے قومی ایجنڈے کی حیثیت سے اختیار کرنے کی سعی کی جائے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ آیندہ صدی میں پاکستان ان اصل مقاصد کی عملی تصویر بن سکے گا جن کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا اور پھر یہ قوم علاقائی اور عالمی ہر میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے گی۔

اسلام کا انداز حکمرانی

اسلام نے حکومت و اقتدار کی ان تمام لذتوں کو حرام قرار دیا ہے' جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا حکمران نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے' نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے' نہ قانون حق کے خلاف ایک پتا ہلا سکتا ہے' نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبے سے بچا سکے' نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے' نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا اور اگر حرام کا ایک پیسہ' جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ' تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ' ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ' اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔

اسلام میں حاکم یا فرماں روا کی اصلی حیثیت اور اس کی منصبی ذمہ داریوں کی صحیح کیفیت حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبے میں بیان کی تھی۔ انھوں نے فرمایا:

لوگو! مجھے تمھاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے' حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے جب تک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں۔ اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں۔ لوگو! میری حیثیت تمھارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے سیدھی راہ چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک خطبے میں اس منصب کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

تمھارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے مال سے اس کے ولی کا ہوتا ہے۔ اگر میں خوشحال رہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر تنگ دست ہوں گا تو جو میرا جائز حق الخدمت ہو گا وہ لے لوں گا۔ میرے اوپر تمھارے کچھ حقوق ہیں اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو۔ مجھ پر فرض ہے کہ تم سے خراج کی مد میں اور اس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں فے میں عطا فرمایا ہے' کوئی ٹیکس بے جا وصول نہ کروں۔ اور تمھارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں آئے وہ جائز مصرف کے سوا کسی اور صورت سے نہ نکلے۔

اس طرح ہر قسم کی شاہانہ طمطراق' حاکمانہ مطلق العنانی' مال و دولت کی فراوانی اور نفس کی تمام لذتوں اور راحتوں کو نکال دینے کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کا جو خشک اور بے مزہ حصہ باقی رہ جاتا ہے' وہ خود اسلام ہی کی زبان میں یہ ہے: "ان کو اگر ہم نے زمین میں قدرت و اختیار عطا کیا تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے" (الحج ۲۲:۶)۔ یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپؐ کے خلفاے راشدینؓ نے اس کا پورا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے--- ہم چند مثالیں پیش کر کے بتائیں گے کہ اسلامی حکومت کا معیار کیا ہے۔

بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر آتی ہے۔ قریش کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں آپؐ عام لوگوں کی طرح اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دے دیں۔ سفارش کے لیے آپؐ کے سب سے زیادہ عزیز و محبوب شخص (اسامہ بن زیدؓ) کو بھیجتے ہیں۔ مگر آپؐ ان کی سفارش کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ: "تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ کم حیثیت لوگوں پر تو تعزیر کا حکم جاری کرتے تھے اور شریف و معزز لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے"۔ پھر جوش میں آکر فرماتے ہیں: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا" (بخاری - ابن ماجہ)۔

جنگ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد (ابو العاص) گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ عام قیدیوں کی طرح انھیں بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے مال نہیں ہوتا تو حکم ہوتا ہے کہ گھر سے منگا کر دو ورنہ قید رہو۔ وہ اپنی بیوی یعنی رسولؐ اللہ کی بیٹی حضرت زینبؓ کو پیغام بھیجتے ہیں اور ان کے پاس سے شوہر کے فدیے میں ایک قیمتی ہار آتا ہے جو حضرت خدیجہؓ زوجہ رسولؐ اللہ نے ان کے جہیز میں دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر آپؐ کو اپنی رفیقہ حیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ تاہم خود اپنے اختیار سے فدیہ معاف نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں سے اجازت مانگتے ہیں کہ اگر تم پسند کرو تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادِ واپس کر دی جائے' اور جب عام مسلمان اس کی اجازت دے دیتے ہیں' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے داماد کو بغیر فدیہ کے رہائی نصیب ہوتی ہے (طبری - ابوداؤد)۔

حدیبیہ کے مقام پر رسولؐ اللہ اور کفار قریش کا معاہدہ ہوتا ہے۔ صلح کی شرائط طے ہو چکی ہیں اور معاہدے کی کتابت ہو رہی ہے۔ عین اس حالت میں ایک مسلمان ابوجندلؓ بن سہیل کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ بدن پر مار کے اتنے زخم ہیں کہ چور چور ہو رہا ہے۔ وہ آکر مسلمانوں کے سامنے گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدارا مجھے ان کی قید سے نکالو۔ رسولؐ اللہ کی زکاب میں

۱۴ سو تلوار بند مسلمان ہیں اور آپؐ کے ایک اشارے میں ابو جندلؓ کو رہائی مل سکتی ہے، مگر کفار سے شرط طے ہو چکی ہے کہ: "قریش والوں میں سے جو شخص مسلمانوں کے پاس جائے گا وہ واپس کر دیا جائے گا اور مسلمانوں میں سے جو شخص مکہ جائے گا وہ واپس نہ کیا جائے گا" اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے زخم دکھا کر فریاد کرتے ہیں کہ کیا آپؐ مجھے پھر اسی ظلم کا تختہ مشق بننے کے لیے واپس کرتے ہیں۔ مگر آپؐ فرماتے ہیں: "ابو جندل! صبر کرو اور ضبط سے کام لو۔ ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تمھارے لیے رہائی کی کوئی صورت نکالے گا" **(فتح الباری، ج ۵، باب الشروط فی الجہاد)**۔

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج مسلمانوں کے مقابلے پر جمع کرتا ہے اور شام و فلسطین سے مسلمانوں کو نکال دینے، بلکہ ان کی قوت کو کچل دینے کا عزم کر لیتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی میں اپنی قوت کے بچاؤ کے لیے مسلمانوں کو ایک ایک پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ حمص کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو خراج ان سے وصول کیا تھا، اسے یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمھاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس لیے اب تم اپنا انتظام خود کرو۔ اس پر اہل حمص کہتے ہیں: "تمھارا عدل و انصاف ہم کو اس ظلم و جور سے زیادہ عزیز ہے جس میں ہم پہلے مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج سے تمھارے عامل کی قیادت میں مقابلہ کریں گے" (فتوح البلدان للبلاذری)۔ یہ بات یاد رہے کہ ہرقل ایک عیسائی بادشاہ تھا، اور یہ لوگ بھی جو اپنے مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے، عیسائی تھے اور صدیوں سے رومی سلطنت کے زیر حکومت تھے۔

جنگ صفین میں جاتے وقت خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ کھوئی جاتی ہے۔ جنگ سے واپس آتے ہیں تو وہی زرہ دارالخلافہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے۔ آپ اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو میری ملک ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضے میں ہے۔ خلیفہ وقت کو یقین ہے کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے اور یہ وہی زرہ ہے جو کھوئی گئی تھی، مگر باوجود اس کے وہ اپنے شاہانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک بے بس مدعی کی طرح قاضی شریح کی عدالت میں جا کر استغاثہ کرتے ہیں۔ قاضی ان کی جلیل القدر شخصیت کا لحاظ کر کے محض ان کے دعوے پر فیصلہ نہیں کر دیتا۔ کہتا ہے کہ آپ زرہ کی ملکیت کا ثبوت پیش کیجیے۔ وہ اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے، رسولؐ اللہ کے نواسے، امام حسنؓ کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ قاضی کہتا ہے کہ امام حسنؓ کی شہادت معتبر نہیں کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے دعوے پر بیٹے کی شہادت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ حال دیکھ کر یہودی باآواز بلند کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ جس دین میں یہ انصاف ہے، وہ ضرور سچا دین ہے **(سیوطی)**۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے پاس ان کا ایک عامل جزیے کی کثیر رقم لے کر حاضر ہوتا ہے۔ آپؓ پوچھتے ہیں: "یہ کیا ہے؟" وہ کہتا ہے: "جزیہ ہے جو ذمیوں سے وصول کیا گیا ہے"۔ مال کی کثرت کو دیکھ کر آپ کو گمان ہوتا ہے کہ جبراً وصول کیا گیا ہو گا۔ فرماتے ہیں: "کہیں تم نے لوگوں کو تباہ تو نہیں کر دیا"۔ وہ کہتا ہے: "خدا کی قسم! ہم نے نہایت نرمی سے وصول کیا ہے"۔ پوچھتے ہیں: "بغیر مارے باندھے؟" وہ عرض کرتا ہے: "واللہ بغیر مارے باندھے"۔ تب کہیں وہ رقم بیت المال میں داخل کی جاتی ہے (فتح البیان)۔ امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ذمہ دار افسر کوفہ سے اور دس بصرہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چار مرتبہ شرعی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ یہ رقم حلال ہے اور کسی مسلمان یا ذمی سے ظلم کے ساتھ وصول نہیں کی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے ابوشحمہ شراب پیتے ہیں تو ایک معمولی مجرم کی طرح گرفتار کر لیے جاتے ہیں، خود حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے انھیں ۸۰ کوڑے لگاتے ہیں اور ان کوڑوں کے صدمے سے ان کا انتقال ہو جاتا ہے (معارف ابن قتیبہ، ذکر اولاد عمر)۔ عمرو بن عاصؓ گورنر مصر کے بیٹے عبداللہ ایک شخص کو مارتے ہیں۔ وہ دربار خلافت میں استغاثہ کرتا ہے اور حضرت عمرؓ خود اسی شخص کے ہاتھ سے عبداللہ کو کوڑے لگوا دیتے ہیں۔ خود عمرو بن عاصؓ کے متعلق خبر آتی ہے کہ ان کے پاس بہت دولت اکٹھی ہو گئی ہے۔ حضرت عمرؓ انھیں لکھتے ہیں: "گورنر ہونے سے پہلے تو تمھارے پاس اتنا سازوسامان نہ تھا اب یہ کہاں سے آگیا"۔ وہ جواب دیتے ہیں: "میرا صوبہ ایک زرخیز علاقہ ہے، اس لیے میرے پاس میرے خرچ سے بہت کچھ مال بچ رہتا ہے"۔ یہ جواب حضرت عمرؓ کو مطمئن نہیں کرتا۔ آپ محمد بن مسلمہؓ کو پورے اختیارات دے کر بھیجتے ہیں۔ وہ مصر پہنچ کر ان کے مال کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، ان کے پچھلے اثاثے کا حساب کرتے ہیں، گورنری کے زمانے میں اس مال پر جو معقول اضافہ ہو سکتا تھا اس کا اندازہ لگاتے ہیں، اس کے بعد جو زائد مال بچتا ہے اسے ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں۔ مصر کا بااختیار گورنر جس کی حدود مملکت طرابلس تک پہنچی ہوئی تھیں، یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور دم نہیں مار سکتا (بلاذری)۔

مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کے خلاف شکایت پہنچتی ہے کہ ان کا ایک عورت سے ناجائز تعلق ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم دیتے ہیں: "بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنالیا ہے، تم وہاں کی گورنری کا جائزہ لو اور مغیرہؓ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو"۔ حکم کے مطابق مغیرہؓ مدینہ بھیجے جاتے ہیں۔ خود حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ جرح میں گواہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ شہادتوں میں شدید اختلاف واقع ہوتا ہے۔ جرم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے مغیرہؓ کو رہائی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: "اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں یقیناً تم کو سنگسار کر دیتا"۔ یہ مغیرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے، عرب کے

چار مشہور ترین سیاسی مدبروں (امیر معاویہؓ' عمرو بن عاصؓ' مغیرہ بن شعبہؓ اور زیادؓ بن ابی سفیان) میں سے ایک تھے۔ اسلام کی بڑی بڑی سیاسی و جنگی خدمات انجام دی تھیں مگر ان کی عظمت و شان' بیش قیمت خدمات' گورنری کی اعلیٰ پوزیشن' عرب میں ان کی شہرت و عزت' غرض کوئی چیز ان کے کام نہ آئی اور ایک معمولی مجرم کی طرح انھیں پیش ہونا پڑا۔ دنیوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ ہے۔ بلکہ آج کل کی مہذب ترین حکومتوں کے قوانین میں زنا اگر طرفین کی رضامندی سے ہو تو سرے سے کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ لیکن جس حکومت کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا' اس میں کسی ایسے شخص کے لیے گنجایش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔

فارس کے علاقے میں مسلمان ایک شہر (شہریاج) کا محاصرہ کرتے ہیں اور محصورین کی مزاحمت اس حد تک کمزور ہو جاتی ہے کہ شہر کا فتح ہونا بالکل یقینی ہو جاتا ہے۔ عین اس حالت میں اسلامی فوج کا ایک غلام شہر والوں کے نام امان نامہ لکھتا ہے اور اسے تیر میں باندھ کر شہر میں پھینک دیتا ہے۔ دوسرے دن جب اسلامی فوج شہر پر حملہ کرتی ہے تو اہل شہر دروازہ کھول کر باہر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ہم کو امان دے چکا ہے' اب تم کیوں برسرپیکار ہو؟ امان نامہ دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام کی تحریر ہے۔ اس معاملے میں حضرت عمرؓ سے استصواب کیا جاتا ہے کہ اس امان نامے کی کیا وقعت ہے؟ جواب میں آپ لکھتے ہیں: "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے۔ اس کے ذمہ کی وہی قیمت ہے جو عام مسلمانوں کے ذمہ کی ہے۔ لہٰذا اس کی دی ہوئی امان نافذ کی جائے" (بلاذری ذکر کور فارس)۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ملک عرب کی سلطنت کے بااختیار فرماں روا منتخب کیے جاتے ہیں۔ انتخاب کے دوسرے دن حضرت عمرؓ انھیں دیکھتے ہیں کہ سر پر کپڑوں کے تھان لادے ہوئے بازار جا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں: "اب آپ مسلمانوں کے امیر ہیں' آپ کو یہ کام زیبا نہیں ہے"۔ وہ جواب دیتے ہیں: "پھر میں اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ کیونکر پالوں؟" حضرت عمرؓ تجویز کرتے ہیں کہ یہ کام آپ کے لیے ابو عبیدہؓ کر دیا کریں گے۔ چنانچہ ان سے خلیفہ اسلام کا یہ معاملہ طے ہوتا ہے کہ وہ ان کی تجارت کا کام سنبھالیں اور ان کے اہل و عیال کے لیے ایک متوسط درجے کے مہاجر کی خوراک اور گرمی جاڑے کا کپڑا مہیا کر دیا کریں۔ پھر بیت المال سے خلیفہ کے لیے ۵۰۰ درہم (آج کل کے حساب سے سو روپے سے کچھ زائد) ماہانہ تنخواہ مقرر ہو جاتی ہے۔ جب انتقال کا وقت قریب آتا ہے تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد سے میرے مال میں جو کچھ اضافہ ہوا ہو' اس کا حساب کرنا اور وہ سب نئے خلیفہ کے سپرد کر دینا۔ چنانچہ انتقال کے بعد جب حساب کیا جاتا ہے تو ایک اونٹنی' ایک زنگی غلام' اور ایک پرانی چادر کے سوا کچھ نہیں نکلتا (فتح الباری' ج ۵' کتاب البیوع)۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلامی فتوحات کا سیلاب ایران سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیل گیا تھا۔ غنائم اور اموال خراج کی اس قدر کثرت تھی کہ کروڑوں درہم سالانہ خزانے میں داخل ہوتے تھے۔ قیصرو کسریٰ کے سارے خزانے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ مگر خود اس سلطنت کے فرماں روا کا یہ حال تھا کہ بدن پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے کپڑے ہوتے تھے۔ پاؤں میں پھٹی ہوئی چپلی اور سر پر بوسیدہ عمامہ پہنے ہوئے یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کی خبر گیری کرتے پھرتے تھے۔ روم و عجم کے لوگ آتے تو انھیں عام مسلمانوں میں فرماں روائے عرب کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔ شام کا سفر کیا تو اس شان سے کہ لوگ خلیفہ اسلام اور اس کے غلام میں تمیز نہ کر سکے۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو پیادہ پا تھے اور ایسے موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے خیال سے شرم آنے لگی۔ اونٹنی کا دودھ، زیتون کا تیل، سرکہ اور گیہوں کی روٹی، یہ بہتر سے بہتر غذائیں تھیں جو انھیں نصیب ہوتی تھیں۔ جب انتقال ہوا تو گھر میں اتنا اثاثہ نہ تھا کہ قرضے ادا کیے جاتے، اس لیے رہنے کا مکان بیچا گیا اور اس سے قرضے ادا کیے گئے۔

یہ واقعات قصہ و افسانہ نہیں، تاریخ کے مستند حقائق ہیں۔ انھیں دیکھ کر بتاؤ کہ دنیا میں اس سے بہتر حکومت کا کوئی اور بھی نمونہ موجود ہے؟ جن لوگوں کا آئین ملک داری اس تقویٰ و طہارت، اس خدا ترسی، اس بے نفسی و بے غرضی، اس حریت و مساوات، اس عدل و انصاف، اس وفائے عہد اور اس دیانت و امانت پر قائم ہو، کیا ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا، یا بالفاظ صحیح تر دنیا کی خدمت کرنا صرف انھی کا حق ہے؟ اگر انھوں نے عجم کے عیش پرست اور ظالم حکمرانوں سے عجم کا تخت خالی کرا لیا، اگر انھوں نے روم کے سیہ کار اور جفا پیشہ فرماں رواؤں کو روم کی حکومت سے بے دخل کر دیا، اگر انھوں نے آس پاس کی تمام شیطانی حکومتوں کے تختے الٹ دیے اور ان کی جگہ یہ منصفانہ حکومت قائم کی تو بتاؤ کہ یہ انسانیت پر ظلم تھا یا اس کی خدمت؟ ان کے مقابلے میں مغرب کے ان جھوٹے مدعیوں کی کیا وقعت ہے جن کو تقویٰ و پرہیزگاری سے واسطہ نہیں، وفائے عہد کی ہوا تک نہیں لگی۔ عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے بعد تام ہے، اور بجز ملک گیری کی ہوس، مال و زر کی حرص، اور حصول اقتدار کی خواہش کے کسی اور جذبے سے آشنا نہیں ہیں؟

ہم کو تسلیم ہے کہ بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کی اکثر حکومتوں کا عمل اس اصول جہاں بانی کے مطابق نہیں رہا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ مگر یہ نقص اسلام کا نہیں، اس کے پیروؤں کا ہے۔ اسلام تو ایک قانون ہے جو قرآن اور سنت رسولؐ سے ماخوذ ہے۔ جو حکومت اس قانون کے مطابق عمل کرتی ہے، وہ اسلامی حکومت ہے اور جس کا عمل اس کے خلاف ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ ہمارے لیے مسلمان بادشاہوں کا عمل حجت نہیں ہے بلکہ اسلام کا قانون حجت ہے۔ **(الجہاد فی الاسلام)**

فہم قرآن

قیادت کے تقاضے

سید قطب شہیدؒ

قرآن اس امت کی زندہ کتاب اور اس کی بہترین رہنما ہے۔ درحقیقت قرآن ہی وہ درس گاہ ہے جس میں امت مسلمہ نے اپنی زندگی کے درس لیے تھے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے امت مسلمہ کے اولین گروہ کی--- جس کے لیے اس نے مقدر کر دیا تھا کہ اس کے ہاتھوں زمین میں اس کا ربانی نظام قائم ہو--- تربیت فرمائی تھی۔ اس قرآن کے ذریعے اسے اس کار عظیم کے لیے تیار کرنے کے بعد ہی اس کام کو اس سے وابستہ کیا تھا۔ درحقیقت اللہ کا منشا یہ تھا' اور ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن باقی رہنے والا زندہ جاوید رہنما بنے جو مختلف ادوار میں اس امت کے مختلف گروہوں اور نسلوں کی قیادت اور تربیت کر سکے اور انسانیت کی صحیح راہنمائی و قیادت کے لیے اس امت کو تیار کر سکے' کیونکہ اللہ نے اسے انسانیت کا قائد بنانے کا وعدہ کیا ہے بشرطیکہ وہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرتی رہے' قرآن سے کیے ہوئے عہد کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہے' اپنی زندگی کا پورا نظام قرآن سے اخذ کرتی رہے اور اس نظام کے ذریعے زمین کے جملہ نظاموں پر--- جو فی الحقیقت جاہلیت کے نظام ہیں--- غلبہ حاصل کرے!

قرآن صرف ایک کلام نہیں' جو تلاوت کے لیے ہو۔ وہ ایک جامع دستور ہے! تربیت کا دستور! عملی زندگی کا دستور! اسی لیے اس میں نوع انسانی کے تجربات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس سے امت مسلمہ کو--- جسے وہ پروان چڑھانے اور تربیت دینے آیا ہے--- سبق اور رہنمائی حاصل ہو۔ خصوصیت سے اس میں آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک کے ایمانی دعوت کے تجربات کا تذکرہ ہے' تاکہ وہ امت مسلمہ کے لیے تمام ادوار میں زاد راہ بنیں۔ یہ تجربات ذہنی و قلبی بھی ہیں اور عملی زندگی کے بھی۔ یہ سب اس لیے کہ امت مسلمہ پوری بصیرت کے ساتھ راہ حق پر گامزن ہو اور اس کے پاس یہ عظیم زاد راہ اور متنوع سرمایہ ہو۔

اس لیے قرآن میں قصے اس کثرت' اس تنوع اور اس وضاحت کے ساتھ آئے ہیں! بنی اسرائیل کے واقعات و قصص قرآن کریم میں سب سے زیادہ آئے ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ ہمارے خیال میں

راجح سبب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا تھا کہ امت مسلمہ کے کچھ گروہ اسی طرح کے ادوار سے گزریں گے جن سے بنی اسرائیل گزرے تھے اور وہ اپنے دین اور اپنے عقیدے کے سلسلے میں اسی طرح کے موقف اختیار کریں گے جو بنی اسرائیل نے اختیار کیے تھے۔ اس لیے قرآن نے راہ کی لغزشوں کو بنی اسرائیل کی تاریخ کی صورت میں بیان کیا ہے تاکہ امت ان سے نصیحت و عبرت حاصل کرے اور اس آئینے میں' جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے اس کے سامنے رکھ دیا ہے' اپنی صورت دیکھ لے' قبل اس کے کہ وہ اس طرح کی لغزشوں میں مبتلا ہو یا راہ طے کرنے کے دوران وہ ان لغزشوں پر اصرار کرے۔

قرآن اس بات کا مستحق ہے کہ مختلف ادوار میں ہونے والے امت مسلمہ کے سب گروہ اسے قلبی توجہ کے ساتھ پڑھیں اور اس پر اس حیثیت سے غور و فکر کریں کہ قرآن کی تعلیمات' زندہ اور تازہ بہ تازہ ہدایات ہیں جو آج کے دور میں نازل ہو رہی ہیں اور اس لیے نازل ہو رہی ہیں کہ وہ آج کے مسائل کو حل کریں اور مستقبل کی راہ کو واضح و روشن کریں۔ قرآن صرف حسین و جمیل کلام نہیں ہے جسے خوش الحانی کے ساتھ پڑھا جائے' اور نہ وہ ایسے واقعات کا' جو گزر چکے اور اب واقع نہ ہوں گے' تاریخی دفتر ہے۔

قرآن اسی وقت ہمارے لیے سود مند ہو سکتا ہے جبکہ ہم اسے اس طرح پڑھیں کہ ہم آج کی اور آنے والے کل کی' اپنی زندگی کے لیے اس سے اپنے لیے ہدایات کی جستجو کریں' جس طرح کہ امت مسلمہ کا اولین گروہ قرآن کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا اور اپنی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حالات کے لیے وہ اس سے تازہ بہ تازہ ہدایات حاصل کرتا تھا! قرآن کو جب ہم اس طرح پڑھیں گے تو جو کچھ ہم چاہتے ہیں' قرآن میں موجود پائیں گے۔ ہم اس میں ایسے عجائبات پائیں گے جن کا کسی غافل دل میں گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ تب ہم محسوس کریں گے کہ قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارتیں زندہ و متحرک ہیں اور وہ نشانات راہ کی واضح نشان دہی کر رہی ہیں۔ وہ ہم سے کہہ رہی ہیں کہ "یہ کرو' یہ نہ کرو"۔ وہ ہمیں بتا رہی ہیں کہ یہ تمھارا دشمن ہے' اور یہ تمھارا دوست ہے۔ وہ ہمیں سمجھا رہی ہیں کہ یہ احتیاطی تدابیر ہیں جو تمھیں اختیار کرنا ہیں اور یہ سامان دفاع ہے جو تمھیں تیار رکھنا ہے! وہ تمام معاملات کے سلسلے میں' جو ہمیں پیش آتے ہیں' طویل' مفصل اور دقیق ہدایات دے رہی ہیں۔ اس وقت ہم قرآن میں سامان حیات بلکہ حیات پائیں گے اور تب ہم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ سکیں گے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال ۸:۲۴) "اے ایمان لانے والو! اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو' جبکہ وہ تمھیں اس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے"۔

درحقیقت یہ زندگی کی دعوت ہے! دائمی اور نو بہ نو زندگی کی طرف دعوت! کسی ایسی زندگی کی دعوت

نہیں' جو تاریخ کے صفحات میں سے کسی گزرے ہوئے صفحہ تک محدود تھی!

قرآن گذشتہ قوموں کے تجربات میں سے دو تجربے سورۃ البقرہ (آیات ۲۴۳ تا ۲۵۲) میں بطور نمونہ پیش کرتا ہے اور امت مسلمہ کے' اپنے تجربات کے ذخیرے میں ان کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ اس لیے کہ امت مسلمہ کو دنیا میں اپنے عظیم رول کے ادا کرنے کے سلسلے میں اپنی زندگی میں جو مختلف موقف پیش آنے والے ہیں' ان میں صحیح روش اختیار کرنے کے لیے اسے تیار کرے۔ یہ امت ایمانی عقیدے کی اور اس میدان کے تجربوں کی وارث بھی تو ہے!

پہلے تجربے کے سلسلے میں قرآن یہ نہیں بتاتا کہ وہ کن لوگوں کا ہے! وہ کامل اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتا ہے۔ مگر تذکرہ کافی و وافی ہے! یہ ایک ایسے گروہ کا تجربہ ہے جو خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ (البقرہ ۲:۲۴۳)' "وہ اپنے گھربار چھوڑ کر موت کے خوف سے بھاگ نکلے حالانکہ وہ ہزاروں تھے!"

مگر انھیں نہ خوف سے کوئی فائدہ پہنچا اور نہ گھربار چھوڑ کر بھاگ جانے سے۔ اللہ کے جس فیصلے سے وہ ڈر کر بھاگے تھے' اس فیصلے نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا: فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (البقرہ ۲:۲۴۳)' "اللہ نے ان سے کہا' مر جاؤ! (تو وہ مر گئے!) پھر اس نے انھیں (دوبارہ) زندگی بخشی!"

نہ موت سے بچنے کے سلسلے میں ان کی جدوجہد کارگر ثابت ہوئی اور نہ دوبارہ زندگی ملنے میں ان کی' کسی کوشش کا دخل تھا۔ دونوں حالتوں میں خدا کا جو فیصلہ تھا' وہ نافذ ہو کر رہا۔

اس تجربے کے پس منظر میں قرآن اہل ایمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انھیں خدا کی راہ میں جہاد اور انفاق کرنے پر ابھارتا ہے--- خدا کی راہ میں جہاد و انفاق پر' جو زندگی اور مال' دونوں کا بخشنے والا اور زندگی اور مال' دونوں کو واپس لینے پر قادر ہے!

دوسرا تجربہ بنی اسرائیل کی زندگی کا ہے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے دور کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت بنی اسرائیل اقتدار سے محروم ہو چکے تھے' دشمن ان کی مقدس چیزیں لوٹ کر لے گئے تھے' وہ اپنے دشمنوں سے مغلوب اور ذلیل و خوار اور تباہی و بربادی سے دوچار تھے! یہ سب اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے رب کی ہدایت اور اپنے نبیوں کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے تھے۔ پھر انھوں نے ایک نئی جھرجھری لی' ان کے دل میں عقیدہ جاگ اٹھا اور ان میں جہاد فی سبیل اللہ کا شوق پیدا ہو گیا: اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۴۶)' "انھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک فرماں روا مقرر کر دیجیے تاکہ (اس کی سربراہی میں) ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں!"۔ اس تجربے سے--- جیسا کہ قرآن کا موثر انداز بیان اسے پیش کرتا ہے--- بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں جن میں ہر دور کی امت مسلمہ کے لیے محکم ہدایات ہیں' اس دور کی امت مسلمہ کے لیے بھی' جس کے سامنے قرآن نازل ہو رہا تھا۔

اس پورے قصے سے جو بنیادی اور کلی عبرت سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس بیداری کے--- جو عقیدے کی بیداری تھی--- غیر معمولی نتائج سامنے آئے حالانکہ تجربے کے دوران ان کی طرف سے بار بار کوتاہیوں اور کمزوریوں کا مظاہرہ ہوتا رہا اور لوگ مختلف مراحل میں گروہ در گروہ پیچھے ہٹتے رہے۔ ان سب کوتاہیوں اور کمزوریوں کے علی الرغم مٹھی بھر اہل ایمان کی ثابت قدمی سے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے اور بدترین شکست، کھلی ہوئی ذلت، طویل انتشار اور جابر و متسلط قوتوں کے قدموں میں پامالی کے بعد بنی اسرائیل اس ثابت قدمی کے نتیجے میں فتح، عزت اور غلبہ سے ہم کنار ہوئے اور اسی کے نتیجے میں حضرت داؤد اور پھر حضرت سلیمانؑ کی عظیم حکومتیں وجود میں آئیں۔ یہ وہ انتہائی نقطہ عروج تھا جہاں تک زمین میں بنی اسرائیل کی سلطنت پہنچی۔ یہ ان کا وہ سنہری دور ہے، جس کے ان میں چرچے ہیں! اس مقام تک وہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کبریٰ کے دور میں بھی نہ پہنچ سکے۔ یہ فتح براہ راست ثمرہ تھی بہت سی خرابیوں کے انبار میں سے عقیدے کی بیداری اور جالوت کے عظیم لشکر کے مقابلے میں مختصر سے گروہ کی ثابت قدمی کا۔

اس کلی اور بنیادی نتیجے کے علاوہ اس تجربے سے کچھ جزئی عبرت و نصیحت کی باتیں بھی سامنے آتی ہیں جو ہر دور میں امت مسلمہ کے لیے قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

ان میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ جوش و خروش کے اجتماعی مظاہرے سے رہنما دھوکا کھا سکتے ہیں، اگر وہ اس کے مظاہر پر اعتماد کر لیں، اس لیے فیصلہ کن معرکے میں کود پڑنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس جوش و خروش کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے سربرآوردہ لوگ جو ان میں اصحاب الرائے اور ارباب اثر تھے، اپنے زمانے کے نبی کے پاس آکر مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے ایک فرماں روا کا انتخاب کریں، جس کی سربراہی میں، وہ اپنے دینی دشمنوں سے--- جنھوں نے ان کا اقتدا، ختم کر دیا تھا اور جو ان کے اموال اور ان کے ساتھ آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاروں اور ان کے تبرکات لوٹ کر لے گئے تھے--- جنگ کریں۔ نبی نے جنگ کے سلسلے میں ان کے عزم و ہمت کو جانچنے کے لیے ان سے کہا: هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا (البقرہ ۲:۲۴۶)، "کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تمھیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم جنگ نہ کرو!" تو ان کا جوش و خروش نقطہ عروج پر پہنچ گیا اور وہ نبی سے کہنے لگے وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا (البقرہ ۲:۲۴۶) "ہم بھلا راہ خدا میں جنگ کیوں نہ کریں گے جبکہ ہمیں اپنی بستیوں سے نکالا اور اپنی اولاد سے جدا کر دیا گیا ہے"۔

مگر ان کا یہ بے پناہ جوش تھوڑے ہی عرصے میں سرد پڑ گیا اور وہ مختلف مراحل میں ایک دوسرے کے پیچھے گرتے اور لڑھکتے چلے گئے، جیسا کہ قصے سے واضح ہوتا ہے اور جیسا کہ قرآنی الفاظ اس حقیقت کو مجمل

اس طرح بیان کرتے ہیں: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (البقرہ ۲:۲۴۶)، "مگر جب انھیں جنگ کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے افراد کے سوا سب نے پیٹھ پھیر لی!"

اگرچہ عہد شکنی، وعدہ خلافی اور بیچ راستے میں انتشار و تفرق اختیار کرنے کی روش بنی اسرائیل کا خصوصی مزاج ہے مگر بہرحال یہ ایک انسانی کمزوری ہے جو ان تمام گروہوں میں جو ایمانی تربیت سے تربیت کے اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچتے، پائی جانے والی عام کمزوری ہے۔ ہر دور میں امت مسلمہ کی قیادت کو اس کمزوری سے سابقہ پیش آ سکتا ہے اس لیے بنی اسرائیل کے تجربے سے فائدہ اٹھانا بہتر رہے گا۔

اس واقعہ میں عبرت کا ایک پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ گروہوں اور جماعتوں کی دلیری اور ان کے جوش و خروش کا ایک بار نہیں، بار بار امتحان لینا چاہیے۔ چنانچہ اس قصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے مطالبے کے مطابق جب انھیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان کی اکثریت نے اسی وقت جنگ سے پیٹھ پھیر لی اور صرف ایک قلیل تعداد رہ گئی جو نبی سے کیے ہوئے عہد پر قائم رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جو طالوت کی حکمرانی و قیادت کے سلسلے میں بحث و نزاع کرنے اور اللہ کی طرف سے ان کے منتخب ہونے کی نشانی سامنے آنے اور اس صندوق کے، جس میں ان کے انبیا کی یادگاریں تھیں اور جسے فرشتے اٹھائے ہوئے تھے، واپس آ جانے کے بعد طالوت کے ساتھ ہو کر جنگ کے لیے نکلے تھے! مگر ان کی بھی بڑی تعداد نے پہلے ہی مرحلے میں ٹھوکر کھائی اور ان کے قائد نے ان کا جو امتحان لیا، اس میں وہ کمزور ثابت ہوئے: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (البقرہ ۲:۲۴۹)، "پھر جب طالوت لشکر کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے (لشکر سے) کہا: اللہ ایک ندی کے ذریعے تمھاری آزمایش کرنے والا ہے۔ جو کوئی اس ندی کا پانی پیے گا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں! اور جو نہ پیے--- الا یہ کہ وہ اپنے ہاتھ میں لے کر چلو بھر پانی پی لے--- وہ میرا آدمی ہے، تو تھوڑے سے افراد کے سوا سب نے پانی پی لیا!" لیکن یہ تھوڑی تعداد بھی آخر تک ثابت قدم نہ رہی! زندہ خطرے اور دشمنوں کی کثرت و قوت کے آگے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کے دل جواب دے گئے: فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (البقرہ ۲:۲۴۹)، "پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ کے اہل ایمان نے ندی کو پار کیا تو وہ کہنے لگے: "ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے"۔ اپنے ساتھیوں کی اس پسپائی کے برعکس ایک مختصر مگر چیدہ گروہ ثابت قدم رہا، وہ خدا سے چمٹا رہا اور اس کے بھروسے پر میدان میں ڈٹا رہا، اسی گروہ نے کہا تھا: "كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۲:۲۴۹)، "کتنے ہی قلیل التعداد گروہ کثیر تعداد والے گروہ پر اللہ کے اذن سے غالب ہوئے ہیں اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر و

استقامت اختیار کرتے ہیں"۔ اسی گروہ کی بدولت بنی اسرائیل کا پلڑا بھاری ہوا اور یہ گروہ فتح و نصرت سے ہم کنار اور عزت و غلبہ کا مستحق ہوا۔

اس تجربے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صالح، دور اندیش اور مومن قیادت کیسی ہوتی ہے۔ طالوت کی قیادت میں یہ سب صفات پوری طرح نمایاں ہیں۔ وہ لوگوں کے ظاہری جوش و خروش سے فریب میں آنے کے بجائے ان کا امتحان لیتے ہیں۔ وہ ایک امتحان پر بس نہیں کرتے۔ جنگ شروع کرنے سے قبل وہ اپنے لشکر کی عزیمت اور اس کے جذبہ اطاعت کا امتحان لیتے ہیں اور جو لوگ کمزور ثابت ہوتے ہیں انھیں لشکر سے الگ کر دیتے اور پیچھے چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر--- اور یہ پھر بہت اہم ہے!--- وہ کسی حال میں پست ہمتی اور پسپائی اختیار نہیں کرتے حالانکہ ہر تجربے کے بعد ان کا لشکر مختصر سے مختصر ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر میں ان کے ساتھ مختصر سا چیدہ گروہ رہ جاتا ہے۔ مگر وہ اس مختصر سے گروہ کو لے کر خالص ایمان کی قوت اور اہل ایمان سے اللہ کے سچے وعدے کے بھروسے پر جنگ میں کود پڑتے ہیں۔

آخری عبرت جو اس جنگ کے انجام سے ہمارے سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ جس دل کا تعلق اللہ سے ہو جاتا ہے اس کے پیمانے اور تصورات یکسر بدل جاتے ہیں۔ وہ ایک چھوٹے اور محدود واقعے کو ایسی آنکھ سے دیکھتا ہے جو اس واقعے سے ماورا طویل و عریض اور خدا سے متصل حقائق تک پھیلی ہوتی ہے اور اس چھوٹے اور محدود واقعے کے پیچھے اس کی نظر اس ہستی پر پڑتی ہے جو تمام امور کی اصل و بنیاد ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مختصر سا مومن گروہ جو ثابت قدم رہا، جنگ میں کود پڑا اور بالآخر اسے فتح و نصرت حاصل ہوئی، وہ اپنی قلت تعداد اور اپنے اعدا کی تعداد کی کثرت کو اسی طرح دیکھ رہا تھا جس طرح دوسرے لوگ دیکھ رہے تھے، جنھوں نے کہا تھا: **لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ** (البقرہ ۲:۲۴۹) "آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے!" لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہ فیصلہ نہیں کیا جو ان لوگوں نے کیا تھا۔ انھوں نے دوسرا فیصلہ کیا: **كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ** (البقرہ ۲:۲۴۹) "کتنے ہی قلیل التعداد گروہ اللہ کے اذن سے کثیر تعداد والے گروہ پر غالب ہوئے ہیں اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں"۔ پھر اس گروہ نے اپنے رب سے لو لگائی اور اس سے دعا کی: "**رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ** (البقرہ ۲:۲۵۰)، "اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے! ہمیں ثابت قدم رکھ اور اہل کفر کے مقابلے میں ہمیں فتح و نصرت عطا فرما!"

وہ محسوس کر رہا تھا کہ طاقتوں کی میزان اہل کفر کے ہاتھ میں نہیں، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اس نے خدا سے فتح و نصرت طلب کی اور اسے اس ہستی سے پالیا جو اس کا مالک ہے اور اسے عطا کرتا

ہے!--- اللہ سے حقیقی تعلق قائم ہونے اور دل میں صحیح ایمان کے جاگزیں ہونے پر معاملات کے سلسلے میں انسان کے تصورات اور پیمانے اس طرح بدل جاتے ہیں! نیز یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس چھوٹے سے واقعے کو' جو آنکھوں کو نظر آتا ہے' پیش نظر رکھ کر اقدام کرنے سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر--- جو دل کو نظر آتا ہے اور جو بہرحال پورا ہو کر رہے گا۔ اعتماد کر کے اقدام کیا جائے۔

اس قصے میں جو اشارات اور عبرت کے جو پہلو ہیں' ہم ان کا استیعاب نہیں کر رہے! قرآنی آیات کے--- جیسا کہ ہمیں تجربہ سے معلوم ہوتا ہے--- حقائق ہر دل پر اس تعلق کے بقدر' جو وہ قرآن سے رکھتا ہے' اور جو اس کی ضرورتیں ہوتی ہیں' منکشف ہوتے ہیں اور پھر بھی بہت سے حقائق کا ذخیرہ ان کے اندر باقی رہ جاتا ہے تاکہ مختلف مواقع پر' جتنا خدا کی جانب سے مقدر ہے' دلوں پر ان کا انکشاف ہوتا ہے!

(فی ظلال القرآن ترجمہ: سید حامد علی' ج اول' ص ۶۳۰-۶۳۵)

جو

تم سے
مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے
وہ کم تر درجے کا دشمن ہے
مگر جو تمھیں
دین حق سے پھیرنا چاہتا ہے'
وہ تمھارا بد ترین دشمن ہے کیونکہ

پہلا
صرف تمھاری دنیا ہی خراب کرتا ہے' لیکن

دوسرا
تمھیں آخرت کے ابدی عذاب میں
دھکیلنے پر
تلا ہوا ہے

(تفہیم القرآن' جلد ا' ص ۱۶۲)

(بندہ خدا)

عزت و ذلت کا مفہوم

شیخ محمد الغزالی

ترجمہ: محمد فاروق خٹک

عزت و ذلت کا مفہوم مختلف زمانوں میں اقوام و مذاہب کے درمیان مختلف رہا ہے۔ کسی نے دولت کو معیار بنایا اور کسی نے اقتدار کو، جبکہ اسلام کا موقف بالکل واضح ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل۱۷: ۷۰) "یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے اپنی خلافت کا اعزاز بخشا۔ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ ۲: ۳۰) "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ انسان کی عزت کسی صاحب اقتدار یا صاحب ثروت کے سامنے جھکنے کے بجائے اللہ کی اطاعت کرنے اور خَلِيْفَةُ اللّٰه ہونے کا حق ادا کرنے میں ہے کیونکہ کل عزت اللہ کے لیے ہے۔ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (النساء ۴: ۱۳۹) "عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے"۔

اسلام نے مسلمانوں پر حرام قرار دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلکا، بے وزن، ذلیل و کمزور سمجھیں اور کسی صاحب حیثیت شخص کو دیکھ کر اپنے دل میں کمتری کا احساس پیدا کریں۔ انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص نے دنیا کے حصول پر غم کا اظہار کیا، اس نے اپنے رب سے ناراضی کا اظہار کیا۔ جو اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبت پر ہنگامہ کرتا ہے وہ اللہ سے واویلا کرتا ہے۔ جو کسی مال دار کو دیکھ کر اس کی دولت و ثروت کی وجہ سے خاکساری کا اظہار کرتا ہے وہ اللہ کو ناراض کرتا ہے، اور جو قرآن کو پا کر بھی اہل دوزخ کا سا عمل کرتا ہے، وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے"۔ (طبرانی)۔ دوسری روایت ہے: "جو کسی مال دار کی صحبت میں بیٹھتا ہے اور دنیا میں اس کی عزت اور بلندی کی وجہ سے اس کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتا ہے تو اس کا دو تہائی دین ختم ہو گیا، وہ جہنم میں جائے گا"۔ یہ حدیث ان افراد کے لیے تنبیہ ہے جو گردش زمانہ سے مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو چیخنے پکارنے

لگتے ہیں اور مدد کے لیے انسانوں ہی سے امید کرتے ہیں اور مقصد بر آری کے لیے اہل دولت و ثروت کی خاک چھانتے نظر آتے ہیں۔ محرومی سے تکلیف کا احساس کرنا پستی نہیں، لیکن محرومی کا ذلت و رسوائی میں تبدیل ہو جانا، اسلام کی نگاہ میں قابل نفرت عمل ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا: "جس نے برضا و رغبت ذلت کو قبول کر لیا، وہ ہم میں سے نہیں"۔

ایک مسلمان کا اپنے نفس، اپنے دین اور اپنے رب کی توقیر کرنا دراصل اس کے ایمان کی عظمت کی علامت ہے۔ یہ مومن کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بااقتدار شخص کے سامنے اپنے کو چھوٹا محسوس کرے یا کسی بھی جگہ ذلیل و حقیر ہو یا کسی انسان کا ضمیمہ بن کر رہے۔

اس میں ایک طرف سرکشی اور نافرمانی سے اجتناب ہے تو دوسری طرف ذلت و رسوائی سے بھی دوری ہے۔ جس قدر اللہ کے سامنے عاجزی و پستی ہے، اسی قدر بندوں کے سامنے اپنے مقام کا احساس ہے۔ عزت، حمیت اور خودی کا احساس وہ نمایاں صفات ہیں جن پر اسلام نے زور دیا ہے اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں انھیں بنیادی حیثیت دی ہے۔ ان ہی صفات کی طرف حضرت عمرؓ بن خطاب نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے: "وہ شخص مجھے بے حد محبوب ہے جس کے اوپر ذلت تھوپی جائے اور وہ اسے قبول کرنے سے کھلم کھلا انکار کر دے"۔

پانچ وقت اذان و صلوٰۃ میں اللہ کی تکبیر کا اعلان مومن کے لیے یہ تذکیر ہے کہ اللہ کے سوا بڑائی کا ہر دعوے دار اور خواہش مند جھوٹا ہے اور خداوند قدوس کے علاوہ ہر متکبر حقیر ہے۔

عزت ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس کا حصول واجب ہے۔ اسلام نے جب ایک مسلم کو عزت کی وصیت اور تاکید کی تو اس کے حصول کے ذرائع کی نشان دہی بھی کر دی اور اس کے وسائل آسان بنا دیے۔ اس نے بتایا کہ عزت اور بزرگی تو تقویٰ کی وجہ سے ہے، بلندی و برتری خدا کی عبادت سے حاصل ہوتی ہے اور عزت و طاقت اللہ کی اطاعت سے نصیب ہوتی ہے۔ جو مسلمان اس راز کو سمجھ لے، اور پھر ان حقوق کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کے خلاف دفاع کرے تو یہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔ یہ محض انفرادی حقوق کا دفاع نہ ہو گا بلکہ عوامی حقوق اور بلند اقدار کا تحفظ بھی ہو گا۔ حدیث میں ہے: "جو شخص اپنے حقوق کا دفاع کرتا ہوا مارا جائے، وہ شہید سمجھا جائے گا"۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یارسولؐ اللہ! اگر کوئی شخص میرا مال ہڑپ کر جائے تو میرا کیا رویہ ہو گا؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تم اسے اپنا مال مت دو"۔ پوچھا: "اگر وہ جنگ پر آمادہ ہو؟" فرمایا: "تو اس سے جنگ کرو۔ پوچھا: "اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟" جواب دیا: "تم شہید ہو گے"۔ پوچھا: "اگر میں نے اسے قتل کر دیا تو اس کا حشر کیا ہو گا؟" آپؐ نے فرمایا: "وہ جہنم میں جائے گا" (مسلم)۔

جی ہاں--- ایک مومن کی عزت و غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ غاصب کا لقمہ نہ بن جائے۔ ہر حریص اور لالچی کی دستبرد کا نشانہ نہ بنے بلکہ اپنی جان، مال اور عزت و آبرو کے دفاع پر مرمٹے۔ اگر اس راہ میں خون بہے تو کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ بلند اقدار کی حفاظت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک ایک مسلمان کا اخلاق یہ تو ہونا چاہیے کہ اسے کمتر پر غصہ آ جائے تو اسے معاف کر دے لیکن جو اس پر چڑھ دوڑنے کی جرات کرے اور صاحب اقتدار ہو تو اس وقت اخلاق کا تقاضا ہے کہ اسے سبق سکھلیا جائے اور اس کی گوشمالی کی جائے تاکہ اس کے رعب و داب کا بھرم کھل جائے۔ کم تر سے عفو و درگزر اور مجرموں کی گوشمالی، مومنین کی شرافت کی دوسری شکل ہے۔

انسان کی سرشت میں کمزوری و بے چینی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ بسااوقات اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے فرد کے ساتھ عاجزی کا رویہ اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسولؐ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم ان معاملات میں کمزور نہ پڑیں بلکہ فولاد سیرت ثابت ہوں، اپنی پیشانی بلند رکھیں، اور اپنے مطلوبہ مقاصد کے لیے جدوجہد میں لگے رہیں۔ فرمایا: "اپنی ضروریات کی تکمیل عزت نفس کے ساتھ کرو، اس لیے کہ معاملات تقدیر کے پابند ہوتے ہیں"۔ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاملات کی باگ ڈور اللہ کے حوالے کر دے اور اسی پر بھروسہ کرے۔ اپنے دین کی اہمیت اور عظمت کا احساس رکھے لور اسے کمتر تصور نہ کرے۔ اپنی قدر کرے، کسی احمق کو اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ اس پر بڑائی جتا سکے، اس لیے کہ کوئی بھی فیصلہ اسی وقت نافذ ہوتا ہے جب اس میں اللہ کی مرضی کارفرما ہوتی ہے۔

ہم بیشتر اوقات یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم اپنے معاملے میں شکست کھا گئے ہیں، لیکن یہ احساس صحیح نہیں ہے۔ اس سے خدائے قوی و عزیز کے حق کی نفی ہوتی ہے جسے کوئی چیز عاجز و درماندہ نہیں کر سکتی۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۱۲:۲۱)، "اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

حق سے زیادہ قریب، زیادہ نفع بخش اور مسائل کے حل میں مددگار یہی شکل ہے کہ مسلمان ہر حالت میں عزت نفس کا خیال رکھے۔ کسی ضرورت کے سامنے نہ جھکے، کسی مصیبت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے۔ بس مولائے حقیقی سے دعا و مناجات کرے، اسی سے لو لگائے، اسی کے سامنے فروتنی و خاکساری کا اظہار کرے، کسی بھی مخلوق کے سامنے گریہ و زاری نہ کرے۔ اس سرزمین پر "میر کارواں" بن کر رہے۔ زمین کی پستیوں میں آسمان بن کر جینے اور صاحب حیثیت کی طرح زندگی گزارے۔

یقیناً نماز' روزہ ' انفاق' دین ہے
حج اور عمرے کرنا بھی دین ہے
لیکن ---
ان عبادات سے
اللہ کا قرب حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ
معاملات بھی درست ہونا چاہییں!
اپنا جائزہ خود لیجیے

کیا آپ وعدہ پورا کرتے ہیں؟
جو ذمہ داری وقت کے تعین کے ساتھ قبول کرتے ہیں' ادا کرتے ہیں؟

لین دین میں آپ کیسے ہیں؟
قرض لے کر' یاد دلانا' قرض خواہ کی ذمہ داری تو نہیں بنا دیتے؟
آرڈر دے کر رسائل و کتب منگوا کر ادائیگی کے لیے تقاضے تو نہیں کرواتے؟

گھر میں آپ کے رویے کیسے ہیں؟
حسن خلق کے نمونے یا درشت و تلخ!

یہ سب امور دین کا حصہ ہیں
اور جنت کی منزل تک پہنچنے کا'
یا منزل کھوٹی کرنے کا ذریعہ!

(خیر خواہ)

مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی

ہمدردی یا سازش؟

ڈاکٹر تسنیم ابراہیم

ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

مسلم ممالک میں مسلمانوں کی آبادی کو کم کرنے کے لیے عالمی سطح پر جو سامراجی کوششیں ہو رہی ہیں، انھیں نظرانداز کرنا کوئی عقل مندی کی بات نہ ہو گی۔ مسلمانوں کی آبادی کو کم کرنے کے لیے مختلف مختصر المیعاد اور طویل المیعاد منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے سرکاری خزانے، عالمی تنظیموں، مخصوص اداروں اور مختلف سرمایہ داروں کی طرف سے بڑی بڑی رقوم مختص کی گئی ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۴ء میں بخارسٹ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بعد امریکی حکومت نے مسلمانوں کی تعداد کو کم کرنے کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا۔ اس کانفرنس سے امریکہ کے اہم اداروں (جیسے سی آئی اے، وزارت دفاع اور بین الاقوامی ترقی کی امریکی ایجنسی) کی طرف سے امریکہ سے باہر بڑھتی ہوئی آبادی کو امریکہ کے لیے ایک خطرے کے طور پر پیش کیا گیا اور اس کے انسداد کے لیے مفصل رپورٹیں پیش کی گئیں۔ چنانچہ امریکی صدور نکسن، فورڈ، کارٹر، ریگن، بش اور کلنٹن سب ہی نے عالمی آبادی کو کنٹرول کرنے کے منصوبوں میں پوری دلچسپی لی۔

۱۹۹۰ تک نیشنل سیکورٹی کونسل کی طرف سے ان رپورٹوں پر مبنی کسی قسم کی کوئی یادداشت منظر عام پر نہیں آئی۔ اس انتہائی خفیہ عمل کی وجہ سے امریکی قوم اور نہ اقوام عالم ہی اس بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔ ادھر امریکہ کے مسیحی مذہبی پیشوا "خاندان" کے ادارے کی حفاظت کی خاطر سرگرم عمل ہو رہے ہیں لیکن دوسری جانب دنیا بھر کے مسلمان زبردست پروپیگنڈے کی زد میں ہیں۔ آئے دن منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱۹۹۴ میں قاہرہ کانفرنس ہوئی جس کا موضوع انسانی آبادی کو کم کرنا تھا۔ پھر ۱۹۹۵ میں بیجنگ کانفرنس منعقد ہوئی جس کا موضوع "عورت" تھا

اور ۱۹۹۶ میں استنبول کانفرنس برائے "آباد کاری و ترقی" منعقد کی گئی۔

اپریل ۱۹۷۴ء میں ہنری کسنجر نے اس تحریک کی قیادت کی کہ مسلم و عرب ممالک کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مطالعہ کیا جائے، چنانچہ یہ یادداشت نیشنل سیکورٹی اسٹڈیز میمورنڈم (NSSM) کہلائی۔ یہ وہ بنیادی دستاویز ہے جسے امریکی انتظامیہ بین الاقوامی آبادی کو کم کرنے کی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لیے اہمیت دیتی ہے۔ اس دستاویز کو اس لیے خفیہ رکھا گیا کہ اگر ترقی پذیر ممالک (خصوصاً مسلم و عرب ممالک) کو قائل کیے بغیر ان پر تحدید آبادی کی پالیسی مسلط کی گئی تو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اس دستاویز کو خفیہ رکھنا ہی امریکی مفاد میں تھا۔ چنانچہ اس خفیہ پالیسی نے ستر کے عشرے سے لے کر اب تک اس پالیسی کے نافذ کرنے والوں کو متوقع ردعمل سے بچائے رکھا ہے۔ نہ عوام نے سرکشی و نفرت کی، نہ عالمی سطح پر ہی کسی قسم کا بائیکاٹ ہوا۔

اس دستاویز کی رو سے "ترقی پذیر ممالک کی روز افزوں آبادی، امریکہ کے فوجی، اقتصادی اور سیاسی مفادات کے لیے زبردست خطرہ ہے"۔ فروری ۱۹۸۴ میں سی آئی اے نے ایک رپورٹ پیش کی جس کا موضوع تھا: شرق اوسط اور جنوبی ایشیا میں آبادی کے مسائل اور سیاسی استحکام۔ اس رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ شرق اوسط اور جنوبی ایشیا دونوں علاقوں کے کل باشندوں کی تعداد کا ایک چوتھائی، پندرہ سے چوبیس سال کی عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ نوجوان آبادی کو کم کرنے کی پالیسی کے خلاف اسلام کی راسخ العقیدہ قوت کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام ہی مسلم نوجوانوں کی امنگوں اور امیدوں کا مرکز ہے۔

پھر پینٹاگن نے اس رپورٹ کی تائید میں ایک مطالعہ پیش کیا کہ دفاعی منصوبہ سازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آبادی کے منصوبے پر اسی مہارت و اہمیت کے ساتھ غور و فکر کریں اور اسے اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، جس طرح وہ سیکورٹی کے مقاصد کے لیے مسلح ہوتے اور اسلحہ سازی میں پرجوش انداز سے اپنی توجہات مرکوز کرتے ہیں۔

اس خفیہ دستاویز میں روز اول ہی سے بھارت، برازیل، نائیجریا، انڈونیشیا، فلپائن، بنگلہ دیش، پاکستان، ترکی اور ایتھوپیا کی زرخیزی اور بڑھتی ہوئی انسانی آبادی سے خبردار کیا گیا تھا۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ۱۹۹۰ سے اکثر مسلم ممالک (جن کا مذکورہ بالا رپورٹ میں نام لیا گیا ہے) اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کردہ لائحہ ہائے عمل، اصل میں، اعلیٰ امریکی پالیسی ہی کا ایک حصہ تھے۔ اس دستاویز میں چار خطرات سے متنبہ کیا گیا ہے:

۱۔ زیادہ آبادی کے حامل ممالک کا عالمی سیاست پر چھا جانا۔

۲- ترقی پذیر ممالک کے ذرائع و وسائل کی جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے اہمیت۔
۳- نئی نسل کے نوجوانوں کا سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا۔
۴- ان ممالک میں حکومتی پالیسیوں کے سبب امریکی مفادات کو سول نافرمانی یا محنت کشوں کے مظاہروں کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہونا۔

دنیا کی بڑھتی ہوئی انسانی آبادی: دنیا کی بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور اس سے منسلک دیگر عوامل کو امریکہ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا رہا ہے۔ امریکہ ان ممالک کے معدنی اور زرعی وسائل کے استحصال میں ان ملکوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کرنے والوں نے انھی خطرات کے پیش نظر مسلم ممالک میں آبادی کی حد بندی کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

ملازمت کی خاطر ترک وطن کرنے والے مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی جاتے ہیں، اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی اس ملک کے باشندوں کے لیے لے جاتے ہیں، جس سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بین الاقوامی سیاست پر مسلمانوں کی یہ بڑھتی ہوئی آبادی اثرانداز ہوتی ہے۔ امریکہ کی عسکری اور جنگی حکمت عملی کی پالیسیوں میں اس بات کو سرفہرست جگہ دی جاتی ہے کہ دنیا کے کن علاقوں میں انسانی آبادی زیادہ اکٹھی ہو رہی ہے۔

امریکہ دلکش نعروں کے پردے میں اپنے مفادات کی جنگ لڑتا ہے جیسے "انسان کی شخصی آزادی" یا "غریب ممالک کے لیے مستقل ترقی کا بہترین طریقہ--- آبادی میں کمی"۔ امریکہ اقوام متحدہ کے ذریعے مسلم اور عرب ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ پہلے اقوام متحدہ کی آبادی سے متعلق تنظیم کسی بھی ملک کو فنڈ فراہم کرتی ہے، تاکہ وہاں کی آبادی کم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے۔ پھر اس منصوبے کی تکمیل کے لیے امریکہ "امداد" دیتا ہے۔ حکومتیں یہ امداد حاصل کرنے کی خاطر ان کی من مانی شرائط تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ اگر امریکہ کسی ملک میں اپنی اس لوٹ کھسوٹ کے لائحہ عمل میں ناکام ہونے لگتا ہے تو وہ سرمایہ کاری کرنے کے منصوبے کی آڑ میں اپنے مفادات کا کھیل کھیلتا ہے۔ اس موقع پر وہ خود آگے بڑھتا ہے یا دیگر عالمی سرمایہ کاری کرنے والے اداروں--- جیسے ورلڈ بنک، آئی ایم ایف یا راک فیلر وغیرہ جیسے خاص سرمایہ کار اداروں کے ذریعے اس ملک میں سرمایہ کاری کا دلکش جال پھیلاتا ہے۔

جب امریکہ اور اس کی قیادت میں صنعتی ممالک ان ملکوں کی معاشی حالت کا حلیہ بگاڑنے کے بعد ایک ہی حل پیش کرتے ہیں کہ "یہ ممالک اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے اپنی آبادی یکسر کم کر

دیں، تاکہ ان کے ذرائع و وسائل پر بوجھ کم ہو سکے"۔

آبادی کم کرنے کے بارے میں پروپیگنڈہ: اس دستاویز میں کثیر قومیتی اداروں کو اس منصوبے پر لگا دینے، نیز ان کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر تعاون کرنے پر زور دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ آبادی کے بارے میں تعلیمی پروگراموں میں سرکاری اہل کاروں کو شریک کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پھر یہ پالیسی بیان کی گئی ہے کہ ان لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی اور اس کے پروگراموں کے فائدہ مند ہونے کا قائل کیا جائے تاکہ کسی قابل ذکر مخالفت کے بغیر اس پالیسی کو پوری طرح سے نافذ کیا جا سکے۔ سرکاری افسروں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ کثرت آبادی کا دھماکہ کتنا ہولناک ہے اور مسلم خواتین کو انسانی آبادی میں اضافے کے خلاف نبرد آزما ہونے کے فوائد ذہن نشین کرائے جائیں۔

۱۹۷۴ میں کچھ ممالک کی طرف سے اس پالیسی کی شدید مخالفت ہوئی، تاہم اقوام متحدہ کے آبادی کے محکمہ نے اپنی وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی رپورٹوں میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے موقف میں تبدیلی کر لی ہے۔

امریکی پالیسی سازوں نے اپنی منظم تدریجی پروپیگنڈہ مہم کے ذریعے ان ملکوں کی حکومتوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد کانفرنسیں، آموز گاہیں (work shop) ہوتی ہیں۔ معلوماتی لٹریچر وسیع پیمانے پر پھیلایا جاتا ہے۔ یہ حکومتیں اس کی سرپرستی کرتی ہیں۔

ایک امریکی مصنف کا واویلا: اس دستاویز نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے حوالے سے کئی قسم کے اندیشے اور خطرے ظاہر کیے تھے، مثلاً یہ کہ "مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ عالمی سیاسی نظام پر مسلمانوں کا تسلط ہو جائے گا۔ بنیادی اقتصادی ڈھانچے، قوت اور وسائل روزگار پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ فوجی قوت میں اضافہ مسلمانوں کے حق میں جائے گا" وغیرہ وغیرہ۔ اس خوف بھری چیخ کا مغرب کے سیاسی تجزیہ نگاروں اور صحافیوں پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ امریکی استعماری نظام کے ایک پرجوش حامی سیاسی تبصرہ نگار بنو انٹبرگ نے ۱۹۹۱ میں **پہلی عالمی ریاست--- اسلامی ریاست** کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اس نے مغرب کو اسلامی پیش رفت سے خبردار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"۱۹۵۰ میں مسلمانوں کی تعداد ۲۷ کروڑ تھی اور اب وہ ۹۸ کروڑ ہے۔ یہ مسلمان ۲۰۲۰ میں دو ارب ہو جائیں گے۔ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۵ فی صد سے بڑھ کر ۱۹ فی صد ہو چکا ہے، جب کہ ۲۰۳۰ میں ان کا تناسب ۲۵ فی صد ہو جائے گا۔ پوری دنیا میں مسلمان خواتین کی شرح دنیا بھر کی عورتوں سے بڑھ کر ہے"۔

جنوری ۱۹۹۳ میں واشنگٹن پوسٹ نے سیاسی تبصرہ نگار چارلر کو تھامر کا ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد روسی امپریلزم سے بھی بڑھ کر خطرہ ہے لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس لیے اس معرکے میں حصہ لینے والے ہر شخص یا حکومت کی مالی امداد کی جائے، اسلامی اصطلاحات و مفاہیم کو امریکی مفادات کے رنگ میں ڈھال کر پیش کرنے کے لیے کانفرنسیں منعقد کی جائیں اور اس طرح مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر ان میں آبادی کم کرنے کے لیے کام کیا جائے، حتیٰ کہ ان کی شرح آبادی میں اضافہ صفر کی سطح پر پہنچ جائے۔ اس مقصد کے لیے دنیائے اسلام کو ان کانفرنسوں میں پیش کیے جانے والے افکار و خیالات کا ہم نوا بنایا جائے۔

متعدد مخصوص تنظیموں اور اداروں کے اشتراک عمل سے امریکی منصوبے پر عمل کیا گیا۔ ان میں ایک تنظیم کا نام ہے: "ایسوسی ایشن فار والنٹیر سرجیکل کنٹراسیپشن" (AVSC) [تنظیم برائے رضاکارانہ طبی نس بندی و منع حمل] ۱۹۷۲ میں اس تنظیم کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کے لیے ۲۰۰ ملین ڈالر مختص کیے جا چکے ہیں۔ اس تنظیم نے حال ہی میں ۸۰ ملین ڈالر امریکی امداد کا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے، نس بندی میں پیش رفت کی۔ یہ کام ڈاکٹروں، کالجوں اور اسکولوں میں وسیع پروپیگنڈے کے ذریعے ذہنی تطہیر کے بعد کیا گیا۔ فروری ۱۹۹۰ میں انڈونیشیا میں آبادی کی روک تھام کے بارے میں ہونے والی کانفرنس کے بعد اس تنظیم نے بالفاظ دیگر مسلمانوں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ اس حملے کا ہدف "ترقی" اور "آبادی کم" کرنے کا نعرہ ہے۔ ان کے بقول اس کا مقصد "مسئلہ تحدید آبادی کے بارے میں اسلام کے موقف کے متعلق مسلمانوں کے خدشات کو ختم کرنا ہے۔ نیز مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ وہ ترقی کے منصوبوں میں، آبادی کنٹرول کرنے کی پالیسی کو بھی شامل کریں۔

انڈونیشیا میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے حاضرین نے آبادی کم کرنے کی پالیسی کی زبردست مخالفت کی۔ چنانچہ کانفرنس کے دو ماہ بعد طبی ایسوسی ایشن نے ایک میمورنڈم بعنوان آبادی کے بارے میں پالیسی اور اسلام شائع کیا۔ اس یادداشت میں مسلم حکام کو اس امر کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ مسلم علما اور دینی قائدین کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ، آبادی کے مسئلے، خاندانی منصوبہ بندی اور منع حمل کے بارے میں اپنی آرا ظاہر کریں۔ اس کے بعد مسلم حکام بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لیے ایسی رائے اختیار کریں جو اس پالیسی کے مطابق ہو۔ جب یہ مقاصد و اہداف حاصل ہو جائیں گے تو یہ کہہ دیا جائے گا کہ یہ علمائے اسلام کے افکار سے ماخوذ ہیں۔

بین الاقوامی اسلامی مرکز برائے مطالعات و تحقیقات آبادی: اقوام متحدہ کے تمام متعلقہ ادارے اس بات پر متفق ہیں کہ دینی اداروں کے ذریعے تحدید نسل کی پالیسی کو رائج کیا جائے تاکہ مختلف

سمتوں سے اٹھنے والی مخالف تحریکوں کا سدباب ہو سکے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے فنڈ برائے آبادی نے ایک اسلامی مرکز کے قیام اور اس کے لیے کئی پروگراموں کی منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ جب امومت (مادریت، motherhood) کے بارے میں اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں ماؤں کو بتایا گیا کہ وہ حمل کے دو وقفوں کی درمیانی مدت کو کیسے بڑھائیں تاکہ ان کی صحت اچھی رہے۔ اس کانفرنس نے منع حمل کو جائز قرار دیا۔ آیندہ برس کانفرنس "برائے آبادی و خاندانی منصوبہ بندی" ہوئی تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ تحدید نسل اور منع حمل کے بارے میں مخصوص فکری رجحانات پر اسلام کے اثرات کہاں تک ہیں؟

اس کے بعد رباط کانفرنس ہوئی جس میں عالم اسلام کی نمایندگی منتخب گروہوں نے کی۔ اس کانفرنس میں اقوام متحدہ کے "تحدید آبادی فنڈ" کی طرف سے ایک ٹیلی گرام پڑھ کر سنایا گیا۔ جس میں حاضرین کو ترغیب دی گئی کہ وہ اس ضرورت کا احساس کریں کہ ازہریونی ورسٹی میں ایک "مطالعہ و تحقیق آبادی سنٹر" قائم ہو، جس کا مقصد طلبہ کی علمی تربیت ہو، تاکہ وہ تحدید نسل کے لیے مخصوص مواد شائع اور تقسیم کرنے کا کام کر سکیں۔ مزید یہ کہ ازہریونی ورسٹی میں انھی موضوعات پر کانفرنسیں اور مذاکرے ہوں۔ ازہریونی ورسٹی کی طرف سے دیگر مسلم ممالک کو اس موضوع پر ہدایات دی جائیں۔ ٹیلی گرام میں یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ علما جلد ہی اس قسم کا مرکز قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کریں گے۔

چنانچہ یہ مرکز اسی عشرے میں قائم ہوا، اور اس کے قیام سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی گویا کہ یہ "فکر اسلامی" کی طرف رجوع کرنے کا عمل ہے حالانکہ یہ سب کچھ مخصوص استعماری منصوبے کا ایک حصہ ہے۔

جب اس مرکز نے اعلان کیا کہ مصری عورتوں کی تولیدی صلاحیت کو منظم پروپیگنڈہ اور بصری ذرائع ابلاغ سے کنٹرول کرنے کی سخت ضرورت ہے، تب ۱۹۸۸ میں امریکہ نے اس سنٹر کی سرگرمیوں کے لیے فراخ دلانہ مدد دی۔

پنج سالہ منصوبہ: چنانچہ "الازہر" کے نام سے مذکورہ مرکز نے کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنا پانچ سالہ منصوبہ بنایا۔ ۱۹۹۰ میں اس منصوبے کا ہدف صومالیہ کے مسلم راہنما تھے۔ اس مرکز نے ایک کانفرنس بلائی۔ موضوع سخن تھا: "بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ اور اسلام"۔ ادھر "امریکی ایڈ پروگرام" کی طرف سے اعلان ہوا کہ اس کانفرنس کا ہدف اسلام کے بارے میں تبادلہ خیالات و آرا ہے۔ صومالیہ کو یہ کہہ کر ہم نوا بنا لیا گیا کہ اس طرح وہاں آبادی کے مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ اس مرکز نے ۹۲-۱۹۹۱ میں الازہر یونی ورسٹی کے نام سے اپنے جن اعلانات کا متن بھیجا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ:

"عالم اسلام کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لیے اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی

ہے کہ الازہر کے نصاب میں خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں تعلیمی پروگرام شامل کیے جائیں، تاکہ وہاں کے طلبہ، مستقبل کے مسلم قائدین--- میں یہ شعور و احساس پیدا کیا جائے کہ ان کے ممالک کو کثرت آبادی کے کسی زبردست اژدہے کا سامنا ہے۔ مرکز ایک ایسے پروگرام پر عمل کرنے والا ہے جس کی رو سے خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیمات کے پیش نظر تمام درسی نصابوں کی چھان پھٹک کی جائے گی اور اس کے بعد آیندہ مرحلے میں ایک علمی مواد تیار کیا جائے، جسے ازہر یونی ورسٹی کے تمام شعبوں اور اس کے ماتحت کالجوں کے نصاب میں سمو دیا جائے گا۔ اس طرح یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ، مناسب علمی مراحل سے گزرنے کے بعد کثرت آبادی کے خطرات سے آگاہ ہو جائیں گے۔ وہ اپنے خاندانوں کو کثرت آبادی کے نقصانات سے باخبر کر سکیں گے اور لوگوں کو اس بات کی ترغیب دیں گے کہ وہ اپنے بچوں کے رزق کی خاطر بچے کم پیدا کریں"۔

اس مرکز نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے چار لاکھ ڈالر طلب کیے ہیں۔ یہ مرکز اب اپنے آپ کو تمام کانفرنسوں میں مسلمانوں کا نمایندہ سمجھتا ہے اور پورے عالم اسلام کی نمایندگی کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے۔

۱۹۹۲ میں اعلان کیا گیا کہ بنگلہ دیش میں ۱۶۵ ہزار عورتوں کو بانجھ بنا دیا گیا ہے۔ اس پر وہاں شدید مظاہرے ہوئے جن میں بہت سے مظاہرین زخمی ہوئے۔ اسی طرح دس لاکھ انڈونیشی عورتوں کو این پی پی (نور بلانٹ بلاصق) مہیا کیے گئے، جن کے استعمال کے بعد پانچ سال کی مدت تک حمل قرار نہیں پاتا مگر عورت کی صحت کو سخت خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔

نائیجیریا میں ایک مشہور مصنف کو اس وقت سخت رسوائی کا سامنا کرنا پڑا، جب اقوام متحدہ کے "محکمہ تحدید آبادی" نے اسے اپنے مقاصد کے لیے بھرتی کر لیا۔ اس شخص نے کئی کتابچے لکھے اور ان کتابچوں میں "منع حمل" کی ضرورت اسلام کی روشنی میں بیان کی گئی تھی۔ اس گمراہ کن لٹریچر کا جواب نائیجیریا ہی کے ممتاز راہنما الحاج عثمان فاروق نے دیا۔ موصوف الحاج کی تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"خاوند، بیوی، ذرائع رزق اور اولاد کے مابین صحیح توازن اللہ تعالیٰ ہی قائم کرتا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے حامی اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ذرائع پیداوار اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی و برگزیدہ لوگوں کے لیے مسخر کر دیے ہیں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ تحدید نسل اس بہیمانہ سطحی زندگی تک پہنچا دیتی ہے جس میں اب اہل مغرب مبتلا ہیں۔ اس سے اخلاقی انحطاط آتا ہے۔ نائیجیریا میں نس بندی کے پروگراموں پر جس طرح عمل ہو رہا ہے، ایسا پہلے مصر میں ہو چکا ہے۔ کس ملک کے مرد و زن کو اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کرنا ہے، اس کا حتمی فیصلہ مغرب کرتا

ہے۔ اس نے اسرائیل کو اس نوعیت کی امداد دی جس سے وہاں عورتوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو' اور اس کی آبادی بڑھے تاکہ وہ عربوں پر عددی برتری حاصل کر لے۔ نائیجیریا کو جلد ہی ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے عالم عرب گذشتہ پینتیس برسوں سے دوچار ہے۔ یاد رہنا چاہیے کہ بچے اللہ تعالیٰ کا بے بہا عطیہ ہیں۔ بچے غلبہ' قوت اور فعال کارکردگی کا منبع ہیں۔ آنحضرتؐ نے اسی لیے نسل بڑھانے کی ترغیب دی ہے"۔

میڈیکل ایسوسی ایشن (AVSC) اور امریکی ایڈ پروگرام کے مابین ایک سمجھوتے کے بعد زائر' سینیگال' زمبابوے' تنزانیہ' گھانا' مالی' فلپائن' مصر' سوڈان' یمن اور ترکی میں منع حمل اور بانجھ کرنے کی مخالفت کرنے والوں کا سامنا کرنے کے لیے متعدد عملی منصوبے بنائے گئے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انٹرنیٹ پر مسلمان علما کے ایسے بیانات بار بار پیش کیے جاتے ہیں جن سے اقوام متحدہ کی خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی کی تائید ہوتی ہے۔ ان کا عنوان ہوتا ہے: "منع حمل اور اسلام قدم بہ قدم چلتے ہیں"۔ ۱۹۹۵ میں انقرہ میں ہونے والی کانفرنس کا موضوع "اسلام میں خاندان" تھا۔ مصر کے مفتی صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی زندگی کو منضبط کرنے کا حکم دیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی اس نظم و ضبط اور باقاعدگی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی محض میاں بیوی کا ایک نجی معاملہ ہے"۔ انٹرنیٹ پر دکھائے جانے والے یہ سارے بیانات مغربی لائحہ عمل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ یہ بتائے بغیر کہ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے شرعی و قانونی وجوہ جواز کیا ہیں؟

قاہرہ کی آبادی کانفرنس کے بعد کا لائحہ عمل: انسانی آبادی کو کم کرنے کی سب سے بڑی عالمی تنظیم انٹرنیشنل پلانڈ پیرنٹ ہوڈ فیڈریشن نے اپنے اہم اہداف و مقاصد یہ بیان کیے ہیں:

۱- صاحب اولاد ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ حقوق انسانی میں سے ایک حق ہے۔

۲- عوام کو صاحب اولاد ہونے کے بارے میں معلومات سے جلد از جلد آگاہ کرنا چاہیے۔

۳- دنیا کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ آبادی کو کنٹرول کریں اور خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کریں۔

۴- مردوں اور عورتوں کو منع حمل ذرائع و آلات مہیا کرنا۔

۵- غریبوں اور عورتوں کو بانجھ پن کی ادویات مفت دینا۔

۶- اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بچوں کی پیدائش کے بارے میں مکمل معلومات اور لٹریچر کی فراہمی۔

۷- عورت کو یہ باور کرانا کہ وہ مرد کے ہم پلہ ہے۔ اس کے بعد اسے منع حمل کے لیے آمادہ کرنا۔

۸- مردوں کو نس بندی کا قائل کرنے کے لیے پروگرام ترتیب دینا۔

۹- دیہات اور شہروں میں اس لائحہ عمل کے فروغ کے لیے پروپیگنڈہ، معلومات اور خدمات کے مراکز کا قیام۔

۱۰- پبلک مقامات پر مشینوں کے ذریعے منع حمل ادویات و آلات کی وافر مقدار میں فراہمی۔

اس منصوبے پر اکثر مسلم ممالک میں کام ہو رہا ہے اور اس کے مطلوبہ نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کا فنڈ برائے آبادی اپنے منصوبوں کے نفاذ کے لیے دیگر متعدد تنظیموں سے مدد لیتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک تنظیم کا نام "پاتھ فائنڈر" ہے۔ یہ تحدید نسل کی فعال ترین عالمی تنظیم ہے۔ سی آئی اے اس کی بھرپور مالی مدد کرتی ہے۔ یہ تنظیم انڈونیشیا کے ایک سو بیس مسلمان علما کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اس نے بنگلہ دیش میں تحدید نسل پر بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ متعلقہ ملک کے عوام کی ذہنی و جذباتی سطح کو مدنظر رکھ کر اپنا پروپیگنڈہ مرتب کرتی ہے، مثلاً یہ تنظیم دیکھتی ہے کہ فلاں ملک کے عوام کو کون سا ٹیلی وژن پروگرام زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ اس پروگرام میں خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اشتہارات کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اس تنظیم نے پانچ زبانوں میں ۳۰۰۰ پروگرام ریڈیو، ٹیلی وژن، فلموں کی نشریات اور اخبارات و رسائل کے اعلانات میں داخل کر دیے ہیں۔ "پاتھ فائنڈر" تنظیم تحدید نسل کے حوالے سے معاشرے کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیتی ہے۔ اس کے بعد تحدید نسل کی دیگر تنظیمیں اس تنظیم کی پیروی کرتی ہیں۔

اسلامی ممالک میں حاصل کردہ کامیابیاں: اقوام متحدہ کی تحدید نسل تنظیم نے اعلان کیا ہے کہ عرب اور مسلم ممالک میں بچوں کی تعداد کی شرح میں قابل لحاظ کمی ہوئی ہے۔ اب ایک خاندان میں بچوں کی اوسط تعداد چار ہو گئی ہے۔ الجزائر، تونس، مصر اور ترکی میں یہی صورت حال ہے۔ رپورٹوں کی رو سے اردن اور یمن میں بھی ایک خاندان میں بچوں کی تعداد کم ہو جائے گی جہاں پہلے اوسطاً ایک خاندان میں چھ بچے ہوتے ہیں۔ تنظیم کی اکتوبر ۱۹۹۶ کی رپورٹ کے مطابق--- فلسطین میں بچوں کے تعلیمی نصابوں میں--- منع حمل تعلیمات کے فروغ کے لیے سات سو دو ملین ڈالر مختص کیے گئے ہیں۔ اسی ہزار ڈالر ہنگامی حالات اور خدمات کے لیے رکھے گئے ہیں، جن سے مارچ کے مہینے میں ایسے پچاس کلینک کھولے گئے۔ عراق میں برتھ کنٹرول کے باسٹھ کلینک قائم کیے جا چکے ہیں۔ وہاں جمعیتہ الہلال الاحمر فلسطین بھی کام کر رہی ہے۔ عراق میں خوراک کے بدلے پٹرول کے معاہدے کی رو سے وہاں ڈاکٹر اور نرسیں بھیجی گئی ہیں۔ تنظیم کے رسالے "بوبیولائیے" میں اردن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہاں پہلے سخت مزاحمت ہوئی مگر اب مزاحمت پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے لٹریچر میں کثرت سے اسلامی اصطلاحات و

تراکیب استعمال کی گئیں۔ رسالے میں یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہی کامیاب چال اختیار کی جائے گی۔

۱۹۹۳ کی عمان کی علاقائی کانفرنس میں اقوام متحدہ کے خاندانی منصوبہ بندی کے ذیلی ادارے نے لبنان میں اپنی سرگرمیوں میں اضافے کا اعلان کیا ہے۔ ماؤں اور بچوں کے دائرے میں نیز اطلاعات اور تعلیم وغیرہ کے شعبوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی اس پالیسی کو اپنایا جائے گا۔ اس مقصد کی خاطر تین سو ایک ملین ڈالر کی رقم مختص کر دی گئی ہے۔ یہ پروگرام ۲۰۰۱ تک جاری رہیں گے۔ لبنان میں تین بچے فی گھرانہ سے کم ہو کر دو بچے فی گھرانہ تک بچوں کی شرح پیدائش میں کمی ہوئی ہے۔ توقع ہے کہ شرح پیدائش میں یہ کمی بالآخر صفر تک جا پہنچے گی۔

درج بالا حقائق سے قارئین یہ جان گئے ہوں گے کہ خاندانی منصوبہ بندی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ایک زبردست جنگی سازش ہے۔ اب مسلم حکمرانوں اور دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے پر غور و فکر کریں اور اس سازش کے انسداد کے لیے مناسب اقدام کریں۔

خاندانی منصوبہ بندی کو بالعموم غربت و افلاس سے مربوط کیا جاتا ہے حالانکہ ہمارے ممالک میں اصل مسئلہ غربت و افلاس کا نہیں بلکہ عوام کا اصل مسئلہ اسلامی تعلیمات سے بے خبری کا ہے۔ مسلم عوام اپنی جہالت کی بنا پر انسان کی قدر و قیمت اور کائنات میں انسان کے برتر مقام اور فلسفہ خلافت و نیابت سے ناآشنا ہیں۔ غریبوں میں جہالت عام ہے یعنی وہ مادی، عقلی اور روحانی ہر لحاظ سے قلاش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مغرب کی چکاچوند کر دینے والی دلکش عبارات اور نعروں سے مرعوب و مسحور ہو جاتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ممالک غریب ہیں۔ عوام اپنی کم علمی کی وجہ سے اور حکمران اپنے مفادات کی خاطر مغرب کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر مسلم ممالک میں جاگیرداری کو ختم کر دیا جائے اور ذرائع پیداوار کو اسلامی نظام کے مطابق عدل سے تقسیم کیا جائے، ذخیرہ اندوزی اور زراندوزی کے خلاف جنگی پیمانے پر مہم چلا کر اس رجحان کا قلع قمع کر دیا جائے تو مسلمانوں میں خوش حالی عام ہو گی اور اولاد سے جان چھڑانے کا مغربی پروپیگنڈہ بے اثر ہو جائے گا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے جن کی رو سے عورت کی جسمانی اور نفسیاتی صحت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، جبکہ اس کے برعکس نس بندی، بانجھ کرنے یا منع حمل کے لیے آلات و ادویات کے استعمال سے عورت کو فوری اور دیرپا ذہنی و جسمانی تکالیف و عوارض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے علم بردار یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ مادریت (motherhood) سراپا خیر

ہے۔ مبلغین و مجاہدین کی بہرحال مسلمانوں کو ضرورت ہے اور اس کے لیے آبادی کو گھٹانا نہیں بلکہ بڑھانا چاہیے۔ مسلم مائیں اس سلسلے میں اپنے کردار سے غافل نہیں رہ سکتیں۔ خاندانی منصوبہ بندی درحقیقت ماں اور عورت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے۔ بیجنگ کانفرنس کے بعد مسلم حکومتوں کا فرض تھا کہ وہ عورتوں کے خلاف اس زیادتی کا فوری نوٹس لیتیں۔ بچوں اور نوجوان کے تشخص کو قائم رکھنا اور اس کے لیے مناسب ماحول فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ بچے امت کی نرسری اور مستقبل کے قائد ہیں۔

محسن انسانیت، رسول کریمؐ نے ہمیں خاندان کے ساتھ زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ سکھایا ہے۔ والدین، دادا دادی، نانا نانی اور بچوں کے مابین محبت، رحمت، شفقت اور حسن سلوک ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ رزق اور برکت تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسا پاکیزہ ماحول فراہم کرنا جس میں ہماری نئی نسل پروان چڑھ سکے۔ مائیں اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں، اعلیٰ اخلاق عام ہو سکے۔ گھٹیا اور لچر فلموں، عریاں و فحش رسالوں (مقامی ہوں یا غیر ملکی) پر پابندی عائد ہو۔ بچوں کے لیے گمراہ کن ویڈیو فلموں کو ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ ڈش پر پابندی لگائی گئی ہو، یہ سب مسلم حکام کا فرض ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ ماؤں کی قدر کریں ان کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے بچوں کی صحت، تندرستی قائم رکھ سکیں۔ ان کی مادی، نفسیاتی، ثقافتی اور تعلیمی تربیت کر سکیں۔ اگر مسلم حکمران ایسا نہیں کریں گے تو ان سے قیامت کے دن بازپرس ہوگی کہ انھوں نے اپنے عوام کے لیے امن و امان اور سازگار حالات فراہم کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے۔

مسلم حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غربت و افلاس کے خاتمے، اسلامی تعلیمات اور اعلیٰ اقدار کے فروغ اور پاکیزہ عائلی زندگی بسر کرنے کے لیے مناسب کارروائی کریں۔ والدین کے احترام اور مرد و زن کے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر کام کرنے کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ یوں وہ مغرب کے نظریہ مساوات مرد و زن کا توڑ کریں۔ وہ لوگوں کو بتائیں کہ بڑے خاندان کے کیا فوائد ہیں؟ خاص طور پر دیہی آبادی کے لیے، محنت کش اور کاشت کار خاندانوں کے لیے زیادہ بچوں کے کیا منافع ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو تحدید نسل کے مغربی پروگرام مسلمانوں کی آیندہ نسلوں کو معدوم کر دیں گے۔

امریکی خاندان: امریکہ کی خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی کی مخالفت خود امریکہ کے مسیحی مذہبی پیشواؤں نے ہی شروع کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکی خاندان اس کی زد میں آ چکا ہے۔ خاندانی زندگی درہم برہم ہو رہی ہے۔ امریکی پادریوں نے صدر کلنٹن کے نام ایک احتجاجی خط لکھا ہے جس میں منع حمل، اسقاط حمل اور بانجھ کر دینے کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ جیمس ڈوسن، اڈوین یونگ وغیرہ مسیحی قائدین کی زیر قیادت کئی فیملی گروپوں نے صدر کے نام اپنے خطوط میں اس بات پر سخت احتجاج کیا ہے کہ امریکہ کی

وزارت خارجہ تیسری دنیا کے ممالک کے داخلی معاملات میں کیوں مداخلت کرتی ہے؟ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خاندانی نظام کے بارے میں انجیل کی تعلیمات کے فروغ کے لیے ہمیں بہتر طریقے اپنانے اور آزادی سے کام کرنے دیا جائے۔ مقامی اور عالمی سطح پر غریب طبقوں کو بتایا جائے کہ اولاد سے محبت کرنی چاہیے اور بچوں کو باقی رکھنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ امریکہ کی یہ مسیحی تنظیمیں جدید ترین ذرائع رسل ورسائل کو بروئے کار لاکر خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ یہ عوام میں لٹریچر اور کیسٹس تقسیم کرتی ہیں مگر امریکی حکام ان سے درگزر کرتے ہیں۔ کیا مسلم ممالک میں بھی یہ آزادی عمل مہیا ہے؟

ایک طرف یہ مسیحی تنظیمیں مذہب کے نام پر' امریکہ میں برتھ کنٹرول کے خلاف سرگرم کار ہیں مگران کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ دوسری طرف اقوام متحدہ مسلم ممالک میں نام نہاد مسلمان علما کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے آلہ کار بنا رہی ہے اور لادینی نظریات کو مذہبی عبارات و اصطلاحات میں لپیٹ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ آخر' مسلمانوں کو تباہی سے کون بچائے گا؟

[مصنف عرب نژاد امریکی ہیں]

بحث و نظر

کارل مارکس کی انسان دوستی

زیرنظر بحث ایک مسئلے کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش ہے۔ معاشی زبوں حالی کا شکار معاشروں میں زوال یافتہ اشتراکیت سے کچھ رومانوی سی یادیں وابستہ کی جارہی ہیں۔ مسئلے کی نظریاتی اہمیت بھی ہے۔ اس لیے بہتر تفہیم کی خاطر پروفیسر عبدالقدیر سلیم اور سلیم منصور خالد دونوں کی تحریریں یکجا پیش کی جارہی ہیں۔ بحث و نظر میں تحریریں مختلف نکتہ ہاے نظر کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ترجمان القرآن کا ان سے اتفاق ضروری نہیں۔ (مدیر)

۱

عبدالقدیر سلیم

میرے عزیز بھائی سلیم منصور خالد نے "عالمی سرمایہ داری کا مستقبل" کے عنوان سے میری گزارشات (**ترجمان القرآن**' اکتوبر ۹۷) پر گفتگو کرتے ہوئے اس امر پر استدراک کیا ہے' کہ میں نے کارل مارکس کو "انسان دوست" کہا ہے۔

میں نے جدید سرمایہ دارانہ معیشت کے باوا آدم' ایڈم اسمتھ کے آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت کے فلسفے کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ "کارل مارکس نے انسانی معاشرے اور معیشت کا ایک زیادہ عمیق اور انسان دوست فلسفہ پیش کیا"۔ دوسری جگہ میں نے لکھا تھا کہ "کارل مارکس اور اس کے پیش رو انسان دوست حکمانے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام اور اس کے بھیانک نتائج کے خلاف صداے احتجاج بلند کی تھی"--- یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ میری اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔

کیا کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) فی الحقیقت انسان دوست تھا؟ اس کے دل میں معاشرے کے غریب' محروم' پچھڑے اور مصیبت کے مارے ہوئے (wretched of the earth) لوگوں کے لیے کوئی درد تھا یا نہیں' اس کے بارے میں اس کے سوانح نگاروں کے ہاں بہت کچھ مل جائے گا۔ میں ان تفاصیل میں جانے کے بجائے اس کی زندگی کے چند نشانات کی طرف اشارہ کروں گا۔

مارکس یہودی نژاد تھا، لیکن عام عقیدے کے برخلاف اس کی ولادت ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی، اور اسے عیسائی طریقے کے مطابق بپتسمہ دیا گیا۔ اس کا باپ ایک خوش حال قانون دان تھا، جس نے غالباً اپنے پیشے کی خاطر اپنے آبائی مذہب یہودیت کو ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ تاہم وہ عصری "روشن خیالی" کی تحریکوں کا حامی تھا۔ وہ کانٹ کے عقل پر مبنی عقائد اور والٹیر کی روشن خیالی کا دل دادہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کارل مارکس کی اسی انداز میں تعلیم و تربیت کی۔ مارکس کی اوائل عمری کی تحریروں میں اس کی نسلی یہودیت (مظلومیت، محرومی اور پچھڑے ہوئے طبقے سے وابستگی) اور عیسائی عقیدے (انسانیت کی خاطر قربانی اور ایثار) کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

اپنی علمی اور قلمی زندگی کا آغاز اس نے کولون (جرمنی) کے ایک اخبار میں اداریہ نویسی سے کیا، جس میں پس ماندہ اور مظلوم محنت کش طبقے کی حمایت کی جاتی تھی۔ اگرچہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اس کے قلم کی بہتر مزدوری، نسبتاً بہتر اور کثیرالاشاعت اخبارات میں بھی مل سکتی تھی۔ اسے اپنے نظریات اور تحریکوں میں حصہ لینے کی پاداش میں جرمنی، فرانس اور پھر جرمنی سے نکالا گیا، اور آخر اس نے انگلستان میں پناہ لی، جہاں لندن میں برٹش میوزیم کے کتب خانے میں اس نے مطالعے اور تحریر کے لیے اپنا بیش تر وقت وقف کر دیا۔ اس کی توجہ اور تگ و دو اپنے اس معاشی فلسفے کی اشاعت اور اس کے لیے عملی جدوجہد میں مرکوز رہی، جس کے مطابق تاریخ کی توجیہ "طبقاتی کش مکش" کی اصطلاحات ہی میں کی جا سکتی تھی۔

مظلوم اور محروم محنت کش طبقے کی وکالت اور اس کے لیے جدوجہد نے، اسے اپنے بیوی بچوں کی طرف توجہ دینے کی کم ہی فرصت دی اور وہ انھیں کبھی خوش حال آسودہ زندگی سے روشناس نہ کرا سکا۔ ۱۸۵۰ میں اس کے بیوی بچوں کو کرائے کے مکان سے نکال دیا گیا، اور اس کا سامان ضبط کر لیا گیا، کہ اس کے پاس کرایہ دینے کے لیے رقم نہ تھی۔ اس کے کئی بچوں کا انتقال اسی غربت اور بے کسی میں ہوا--- اس کے الفاظ میں: "بورژوا طبقے کی مسلط کردہ فلاکت [نحوست] کی قربانی" میں۔ یوں وہ ان دانش وروں سے بالکل الگ نظر آتا ہے، جو امیرانہ ٹھاٹھ باٹ اور آسایشوں کو قربان کیے بغیر نہایت آرام کے ساتھ غریبوں اور مظلوموں کی حمایت میں سرگرم نظر آتے ہیں، ان کے حق میں آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مارکس نے معاشرے کے مظلوم اور محروم طبقات کے لیے کسی بھی الہامی اور ماورائے عقل انسانی ہدایت کو واضح طور پر مسترد کیا ہے اور مذہب کو "محنت کشوں کے لیے افیون" قرار دیا ہے، جس کے ذریعے استحصالی طبقات انھیں مطمئن اور خوابناک غفلت میں رکھتے ہیں کہ وہ ان کے ظلم و ستم، ناانصافیوں اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف کھڑے نہیں ہو پاتے۔ اٹھارویں/ انیسویں صدی کے تناظر میں دیکھیں تو یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے، اور اب بھی صورت حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، بقول اقبال ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

روایتی مذہبی طبقات نے انسانوں کو اپنی زبوں حالی کا خوگر اور اپنی قسمت کو "قسام ازل" کی تحریر باور کرانے میں استحصالی طبقات کی پوری پوری مدد کی تھی' اور کر رہے ہیں۔ اس طبقاتی گٹھ جوڑ کے خلاف مارکس کی تحریک "انسان دوستی" پر مبنی ہی نظر آتی ہے' اور اسی لیے اقبال نے نظریاتی اختلاف کے باوجود اس کی نیت (قلب) کو درست قرار دیا ہے' اگرچہ وہ اس کی فکر (دماغ) کو رد کرتے ہیں۔ وہ اسے "پیغمبر بے جبرئیل" قرار دیتے ہیں ۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیلؑ — یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق د باطل او مضمر است — قلب او مومن' دماغش کافراست

(سرمایہ کا مصنف' جو ابراہیم خلیل اللہ کی نسل سے ہے' وہ پیغمبر بے جبرئیل ہے' اس کی فکر میں حق و باطل مخلوط ہیں' اس کا قلب تو مومن ہے' لیکن دماغ کافر[منکر حق] ہے)

اقبال نے مارکس کو "پیغمبر" اسی لیے قرار دیا (اگرچہ وہ ہدایت الہامی سے محروم تھا) کہ پیغمبر کا کام ہی انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے چھڑانا ہے۔ ان کے کلام میں کئی جگہ اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
حق را بسجودے' صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

اللہ کے آگے سجدہ ریز ہونا اور دوسری جانب خواہشات کے بتوں کو تراشنا' بقول اقبال حرم و دیر کا وطیرہ بن چکا ہے۔ کارل مارکس کا تصور مذہب بھی اسے اس طرف لے گیا کہ یہ استحصالی طبقات کا ممد و معاون ہے' لہٰذا اسے مسترد کر دینا چاہیے۔ مارکس کی مذہب بیزاری کا محرک اس کا "انسان دوستی" کا جذبہ ہی تھا۔ اسی طرح اپنی مشہور طویل نظم "خضر راہ" میں "سرمایہ و محنت" کے عنوان سے اقبال نے جس طبقاتی فہم کا اظہار کیا ہے' اسے بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اقبال کی اسلامی فکر سے وابستگی اور اشتراکیت کا استرداد ہر شک و شبہ سے بالا ہے' تاہم وہ کہتے ہیں ۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا' ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسلام کو ایک مکمل نظام حیات سمجھنے والے اگر کارل مارکس کے استرداد مذہب کو اس روشنی میں دیکھیں، جن کا اظہار اقبال کے مندرجہ بالا اشعار اور متعدد مقامات پر ان کے کلام میں ہوتا ہے، تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ وہ کیوں مذہب کو "برگ حشیش" اور "معجون خواب آور" سمجھ کر اس کی مخالفت کرتا تھا۔ وہ خود مذہب کے انقلابی تصور اور کردار سے ناآشنا تھا، اور شاید اسی لیے قابل معافی بھی ہے۔ غالباً اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی، کہ اس کے بعد اس کے فلسفے "مارکسیت" کے نام پر روس میں جو انقلاب آئے گا، اس میں پرولتاریہ [مزدوروں] کی آمریت، مارکس ازم، لینن ازم اور پھر اسٹالن ازم اور ماؤازم کے نام پر کیا گل کھلائے گی، اور زوال اشتراکیت کے بعد سرمایہ داری کس ظالمانہ شان کے ساتھ روس اور باقی دنیا میں ایک "ظہور نو" کا آغاز کرے گی۔

کارل مارکس کے مطلقاً استرداد مذہب کے دو بڑے نقصان ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی فکر، مذہب کی اس طاقت سے محروم ہو گئی جو انسانوں کو کائنات کی خالق، حی ولا یموت قوت سے وابستگی اور آخرت پر یقین کے ذریعے حرکت و نمو کے لامتناہی امکانات سے آشنا کرتی ہے۔ دوسری طرف مذہب اور خصوصاً اسلام پر یقین رکھنے والوں کے دل پر اس نے اس کی فکر کے لیے ایک پردۂ مزاحمت تان دیا ہے، کہ وہ اسے مکمل طور پر مسترد کر دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس پردے کو ہٹا کر دیکھا جائے تو شاید اس کی شخصیت سے بہتر آشنائی ہو سکے۔

۲

سلیم منصور خالد

انسانی تاریخ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خیر و شر کی قوتیں اپنا اپنا حصہ ادا کرتی چلی آئی ہیں۔ یہاں پر ظلم اور زیادتی کے مقابلے میں ہمدردی، احترام اور پاکیزگی کے نقوش زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "دانش، مومن کی گم شدہ میراث ہے"۔ اس لیے دانائی کی بات قبول کرنے کے لیے مسلمانوں نے کبھی اس چیز کو اپنے لیے نفسیاتی مسئلہ نہیں بنایا، کہ وہ کس مذہب یا کس عقیدے کے حامل فرد نے کہی---

ہاں، البتہ ان کا ضمیر اس معاملے میں یہ سوال ضرور اٹھاتا ہے کہ "یہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے کس قدر قریب یا کتنا بعید ہے"۔ بس یہی ایک معیار ہے، جس پر کسی اصول، عمل یا نظریئے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ کلمہ طیبہ کے اقرار کا بنیادی تقاضا اور ایک حد فاصل ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کبھی اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔

جہاں تک محترم پروفیسر عبدالقدیر سلیم صاحب کے مضمون میں مارکس کو "انسان دوست" فرد کے طور پر یاد کرنے کا تعلق ہے، اس بات پر ایک جملے میں ردعمل ظاہر کرنے کی چند بنیادیں ہیں، جنھیں پروفیسر صاحب جیسے صاحب علم و فضل، ایمان و عمل کے حامل اور صاحب دل فرد اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ مارکس کے وکیل صفائی ہیں اور نہ اس کی فکر کے خوشہ چیں۔ انھوں نے یہ جملے اپنی وسیع المشربی میں لکھے تھے، مگر غالباً اختصار کے باعث ان کا تاثر اضطراب انگیز تھا۔ ذیل میں دی جانے والی وضاحت صرف اس لیے ہے، کہ قارئین میں سے اگر کوئی فرد اس بات سے متاثر ہوتا ہے، تو اس کے سامنے حقائق تازہ رہیں۔ ضروری نہیں کہ اس وضاحتی استدلال سے اتفاق کیا جائے، مگر ان باتوں کو بیان کر دینا بہرحال ضروری ہے۔

انیسویں صدی کا مغرب ایک طرف بدترین استعمار کا مرکز اور دوسری جانب حریت فکر کا نقیب تھا۔ وہ ایک طرف مذہب کی عبا چاک کرنے کا علم بردار تھا تو اس کے ساتھ صنعتی انقلاب کا قائد اور اجارہ دار بن کر سامنے آیا تھا۔ مغرب کے اجتماعی ضمیر نے استعماریت، مذہب بے زاری اور خرد افروزی (یا عقلیت پسندی) سے تو کوئی زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ البتہ صنعتی انقلاب کے نام پر ہم وطن صنعت کاروں نے اپنے ہی ہم وطنوں کا لہو چوسنا شروع کیا، اس میں صنعت کار، سرمایہ دار اور بنکار سبھی شامل تھے۔ وہ بنکوں سے سرمایہ لے کر سود کی ادائیگی اور نفع اندوزی کی خاطر انسانوں سے حیوانوں کی طرح کام لینے لگے، محنت کا معاوضہ نام نہاد تھا اور ریاستوں کا استعماری ڈھانچا ان کا پشتی بان بن گیا تھا۔ تب شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ انسانی محنت ایک بے قدر چیز سمجھی جا رہی ہے۔

یہ وہ فضا تھی جس میں کارل مارکس کی صورت میں ایک دانش ور اس ظلم کے کاروبار پر تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ استحصال سے پاک معاشرے کے لیے طبقاتی کشمکش، نظریہ قدر زائد، پرولتاری آمریت اور مذہب سے بیزاری کا تصور پیش کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی کتاب "سرمایہ" کمیونسٹ پارٹی کا "منشور" (۱۸۴۸) اور "انٹرنیشنل" تشکیل پاتے ہیں۔ اس طرح دکھ، حسرت اور مجبوری میں کراہتے ہوئے مزدوروں کی دست گیری کے لیے، انسانی محنت کا استحصال ختم کرنے اور صنعتی ظلم کا پہیہ روکنے کے لیے وہ آگے بڑھتا ہے۔ مزدوروں کے اوقات کار، انسانی حدود میں آ جاتے ہیں اور پسے ہوئے طبقوں میں عزم و ہمت کی نئی قوت پروان چڑھتی ہے۔ ان کی مضمحل روحیں سکھ کا سانس لیتی ہیں۔ حقوق کے حصول کا طاقت ور تصور،

مزدور یونینوں کی شکل میں انقلابی تحریک بن جاتا ہے، اور پھر ۱۹۱۷ میں سب سے پہلی اشتراکی ریاست روس میں قائم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دار اور ان کی پٹھو حکومتیں، ان کمیونسٹوں کی قوت اور شعور سے لرزہ براندام ہو کر سوشل سیکورٹی اور فلاحی ریاستوں کے تصور کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، تاکہ ان کے ہاں کمیونسٹوں کو کامیابی نصیب نہ ہو۔ اس دفاعی حکمت عملی سے جہاں وہ اشتراکی انقلابیوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے میں کامیاب ہوئے، وہاں ان معاشروں میں ایک عام انسان کے لیے بہتری اور سہولت بھی عام ہوئی۔ بیسویں صدی میں افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا کی محکوم قوموں نے برطانوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن سامراج سے آزادی کی جدوجہد کی، تو ان میں سے اکثر تحریکوں کی اخلاقی مدد کمیونسٹوں نے کی (مگر ان کی یہ تائید تمام آزادی پسند قوموں کے لیے کبھی مخصوص نہ رہی) یہ وہ حقائق ہیں، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور ان کا بالواسطہ کریڈٹ بہرحال کارل مارکس کو جاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ بنیادی سوال باقی رہتا ہے کہ "کیا مارکس انسان دوست تھا؟"--- اس سوال کا جواب ہمیں مارکس کی پوری فکر، عمل، تحریک اور نتائج کی دنیا سے تلاش کرنا ہوگا۔ اگر مارکس کی شخصیت، افکار اور عمل کا جائزہ لیا جائے اور مارکس ازم کے چوہتر سالہ تجربے کو دیکھا جائے تو جواب "ہاں" کے بجائے "نہیں" میں آتا ہے۔

کسی بھی فلسفے یا اس کے علم بردار فلسفی کے افکار کا تجزیہ کرتے وقت، ادھوری یا نامکمل نہیں، بلکہ پوری تصویر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہی منصفانہ اور علمی اسلوب ہے۔ اگر جزوی طور پر دیکھ کر کسی فرد کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہو، تو پھر امر واقعہ ہے کہ نازی جرمنی کا آمر مطلق ایڈولف ہٹلر (۱۹۳۴-۴۵) بھی انسانیت دوست قرار پاتا ہے۔ کیونکہ اس کی مسلط کردہ دوسری جنگ عظیم کے مابعد اثرات کے نتیجے میں ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کی لاتعداد اقوام استعمار کی سیاسی غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔ پھر مسٹر گاندھی کو انسانیت دوست ماننا پڑے گا کہ اس نے لیوٹالسٹائی کے فلسفہ عدم تشدد کو جدوجہد آزادی میں ایک موثر عملی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھتے ہوئے ہم انھیں انسان دوست رہنما قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو ہر فرد، چاہے وہ کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو، اس میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رحم کا جذبہ پایا جاتا ہے، چاہے وہ اس قیمتی جذبے کو اپنے بچوں، اپنی برادری، اپنے ملک یا کسی خاص طبقے تک محدود رکھے۔ مگر ایک فطری انسانی حس کی بنیاد پر ہم اس فرد کو انسان دوستی کے مقام پر کھڑا نہیں کر سکتے۔ انسان محض طبقاتی، نسلی یا مذہبی امتیاز سے موسوم اکائی کا نام نہیں ہے، بلکہ اعلیٰ اخلاقی انسانی قدروں کی ترقی اور جائز آدرشوں کی تہذیب و نمو اور احترام آدمیت سے موسوم کرشمے سے مربوط فرد کا نام انسان ہے۔ جو چیز ان قدروں کو پروان چڑھائے یا جو رہنما ان اقدار کی ترقی کے لیے مجموعی طور پر کام کرے، وہ انسان دوست قرار پاتا ہے۔ افسوس کہ کارل مارکس، مزدور اور پسے ہوئے طبقات سے گہری دردمندی کے

جذبات رکھنے کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ مارکس محض ایک قلم کار یا فلسفی نہیں، بلکہ وہ خواب دکھانے اور خوابوں کی تعبیر بتانے والا فرد بھی تھا۔ اس لیے مارکس کے بارے میں رائے دیتے وقت ان امور کو ذہن میں رکھنا ہو گا۔ البتہ مارکس ازم کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے سب سے زیادہ خود مارکس نے، پھر مارکس کے مریدوں اور مارکسی علما نے بقدر استطاعت حصہ ادا کیا۔

براہ راست جائزہ لیں تو مارکسی فلسفے کا بنیادی دعویٰ (thesis) "طبقاتی کشمکش" ہے۔ انسانیت کو محض غریب اور امیر طبقے کی جنگ قرار دینا، درحقیقت دو انسانی طبقوں کے درمیان کشت و خون کرانے کی دعوت دینا ہے اور انسان کو مادی مفادات کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے۔ جس کے مطابق ایک وہ ہے کہ جس کے لیے سب کچھ ہے، مگر دوسرا وہ ہے جسے بالکل ختم ہو جانا چاہیے، یا ختم کر دینا چاہیے۔ یہ چیز انسانی فطرت سے دور اور حیوانی فطرت سے قریب تر ہے۔ جب انسان کو محض ایک معاشی حیوان تصور کر کے اجتماعی معاملات سوچے اور چلائے جائیں گے، تو بظاہر چند کامیابیاں حاصل کر لینے کے باوجود فی الحقیقت وہ امور نوع انسانی کو پھاڑنے، نفرت ابھارنے اور درندگی کی حس کو تیز کرنے کا باعث بنیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح ایک طبقے کو فوقیت دینے اور دوسرے کی مکمل نفی کرنے کے بعد بھی فیض یافتہ لوگ سکون حاصل نہ کر سکے، بلکہ انسانیت ایک دوسرے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ جس کے تحت آزاد دنیا کے ظالم صنعت کار سے قدم ملاتا ہوا سرخ جنت کا ظالم بیورو کریٹ کہیں درجے زیادہ ظالم ثابت ہوا، کہ جس کی مار کھا کھا کر مزدور کو تڑپنے کی بھی اجازت نہ ملتی تھی۔

مارکسی "نظریہ قدر زائد" کی فلسفیانہ موشگافیوں سے قطع نظر، اس پر عمل کرنے کی ابتدا یہ قرار دی گئی کہ "محنت صلاحیت کے مطابق اور معاوضہ ضرورت کے مطابق" مگر یہ دعویٰ بھی ایک خوش کن اور ادھورے خواب سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکی ریاست میں تعلیم اور صحت مفت اور سفر نہایت سستا میسر آیا۔ لیکن مارکس ازم کوئی ایسا اخلاقی نظام پیش نہ کر سکا، کہ جس سے فرد کی داخلی دنیا میں ہمدردی، ذمہ داری اور دیانت کی اعلیٰ قدر کو بیدار کیا جا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مارکسی معاشرہ مقابلے کے فطری جذبے سے عاری اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے احساس سے تہی دامن ہوتا چلا گیا۔ ریاستی وسائل، شہریوں کے لیے محض افیون ثابت ہوئے اور اس طرح ان کی انفرادی اور اجتماعی قوت کار کو گھن کی طرح چاٹنے لگے۔ اشتراکی روس، محکوم قوموں (وسطی ایشیا، قفقاز، ماورائے قفقاز، بالٹک ریاستوں اور مشرقی یورپ وغیرہ) کے معدنی وسائل اور خام مال کی لوٹ کھسوٹ سے اپنی سامراجی فطرت کی تسکین کرتا رہا، اور یوں ایک حد تک اس کا بھرم قائم رہا، مگر آخر کار بے نقاب ہو کر رہا۔ انسانوں کو تب معلوم ہوا کہ انسانی فطرت سے ٹکرانے والے اس نظریے نے ریاست کی چولیں تک ہلا دی ہیں۔

مارکس نے "پرولتاری آمریت" (یعنی مزدوروں کی حکومت کے قیام) کا نظریہ دیا۔ یہ کتنا خوش نما نعرہ تھا کہ "دنیا بھر کے مزدورو' ایک ہو جاؤ"۔ لیکن افسوس کہ ایک چوتھائی دنیا کے مزدور ایک ہونے کے باوجود سکھ اور چین کے وہ ثمرات نہ پا سکے' کہ جن راستوں پر چل کر مارکس نے ایسے پھل پانے اور کھانے کی بشارت دی تھی۔ مزدوروں کی ایک قلیل جماعت نے سب سے پہلے' اسی انقلابی جذبے کے تحت برتر طبقے کے خون سے ہولی کھیلی' اور پھر بچ جانے والے مزدور' کسان طبقے کی گردن پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو گیا۔ "مزدور کبھی غلطی نہیں کرتا'مزدور ہی انسانیت کا محافظ اور پشتی بان ہے" وغیرہ قسم کے جملوں کے جلو میں اس مزدور جماعت نے ایک اعلیٰ مزدور طبقہ بن کر ظلم اور درندگی کی نئی تاریخ رقم کی۔ اشتراکی انقلاب نے ہم وطن انقلاب دشمنوں سے فارغ ہونے کے بعد' ذرا سا اختلاف کرنے والے ہم وطن "انقلاب کے بیٹوں" کو کھانا شروع کیا۔ کبھی اسے "انقلابی جلاب" کہا گیا اور کبھی "ثقافتی انقلاب"۔ بہرحال وقفے وقفے سے انسانی جان و مال' عزت' آبرو' صلاحیت اور احترام آدمیت کا خون کیا گیا' جس سے نظر آنے لگا کہ "عمل' ردعمل اور امتزاج" غالباً اسی رویے کو کہتے ہیں۔ لطف کی بات دیکھیے کہ "مزدوروں" کی قیادت میں چلنے والی ان ریاستوں میں مزدوروں ہی نے سب سے پہلے ہنگری میں ناکام اور پھر پولینڈ میں کامیاب بغاوتیں کیں۔ بعدازاں مشرقی یورپ' اشتراکیت سے ہمہ گیر بغاوت کا مرکز ثابت ہوا۔ افسوس کہ اس بغاوت میں وہاں کے فوجی اور دانش ور' صحافی اور پروفیسر حضرات کوئی قابل قدر حصہ ادا کرنے سے محروم رہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہاں کی فوجیں اپنے ہم وطنوں پر ان "مزدور حکومتوں" کے مظالم کی حصہ دار تھیں اور نتیجہ میں مراعات یافتہ۔ اسی طرح عظمت' دانش' امن' جمہوریت اور انسانیت کے نغمے الاپنے اور اپنی قوم کو خواب آور فکری گولیاں کھلانے والے یہ دانش ور ذاتی ترقی پسندی کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال پر خاموش اور ظلم کے نظام پر قانع تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مزدوروں کی آمریت میں چلنے والی ان ریاستوں میں' آخر مزدوروں ہی نے کیوں بغاوت کی؟

مارکس نے انسان دوستی کی معراج تک پہنچنے کے لیے مذہب اور اخلاقی تعلیمات کی یکسر نفی کی۔ کسی بالاتر ہستی کے وجود سے انکار نے انسانی فطرت میں چھپی ہوئی مفاد پرستانہ حس کو اس سراپا درندگی میں تبدیل کر دیا کہ جس کے نتیجے میں پھر دو طبقے وجود میں آ گئے۔ مذہبی اخلاقیات کی جگہ مارکسی اخلاقیات نے لے لی۔ حصول مقصد یعنی طبقاتی کشمکش اور مزدوروں کی آمریت قائم کرنے کے لیے جھوٹ' فریب' قتل و غارت گری کو روا قرار دیا گیا۔ صدیوں سے موجود چھوٹی بڑی اخلاقی قدروں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔ یہی عمل بنیادی طور پر "انقلاب" تھا۔ انقلاب فرانس (۱۷۹۹) کے نتیجہ میں مذہب سے بے زاری کی جو لہر چلی تھی' مارکس اور مارکس ازم کے ہاتھوں وہ ایک طوفان بلاخیز بن گئی۔ یہ چیز نوجوانوں کے لیے زیادہ مرغوب اور

اصحاب اقتدار کے نزدیک پسندیدہ ٹھیری۔ اس فلسفیانہ مارکسی نکتے نے مادہ پرستی کو نئے مذہب کا روپ دے دیا۔ جس میں دیوتا، روبل اور ڈالر تھے۔ پیغام بر مارکس، لینن (۱۹۲۴-۱۸۷۰)، اسٹالن (۱۹۵۳-۱۸۷۹) اور ماؤ (۱۹۷۶-۱۸۹۳) تھے، جبکہ مادی وجود رکھنے والے "فرشتے" خفیہ سروس، فوج، انتظامیہ اور مرکزی، مقامی، شہری یا قصباتی حکومتیں تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مارکس ازم جہاں بھی ہو گا، وہاں وہ مذہب اور بنیادی انسانی اخلاقی اقدار کی نفی کر کے خالص مادی اخلاقیات استوار کرے گا۔ جب تک پہلے سے قائم اخلاقی اقدار پر حملہ آور ہو کر وہ ان کا نام و نشان نہ مٹا دے، اس وقت تک مارکسی اخلاقیات پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک گیا گزرا مذہب بھی انسانی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا نقیب ہوتا ہے۔ باہر سے کوئی توجہ دلائے یا توجہ نہ دلائے، مگر خود اس مذہب کے ماننے والے لوگ ہی اپنی صفوں میں موجود گم راہ افراد کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ مارکس نے یہودیت اور عیسائیت کے گلے سڑے مذہبی ڈھانچے پر تیشہ چلاتے ہوئے، مذہب کی بنیادی اور انسانیت کی متفق علیہ اخلاقیات تک کو دریا برد کر دیا۔ جب یہ آگ آگے بڑھی تو اس کی تپش سے دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی بری طرح متاثر ہوئے، مگر مارکس اپنے ان متاثرین کو کسی برتر اخلاقی اور روحانی قدر کی ڈور نہ تھما سکا۔ اس المیے نے ان لوگوں کی داخلی زندگی میں زبردست خلا پیدا کیا۔ اس حقیقت کا اندازہ مادی سطح پر لگانا ممکن نہیں۔ جن کے دل پہ گزرتی ہے، اسے وہی رقم کر سکتے ہیں، مگر لفظوں اور حرفوں کی زبان میں نہیں، بلکہ آہوں اور حسرتوں کے روپ میں اپنی روحانی زندگی کا مرثیہ سنا سکتے ہیں۔

اگرچہ یہ بات براہ راست، زیر بحث مقدمے سے متعلق نہیں، تاہم توضیح مطلب کے لیے اس کا ذکر سود مند ہو گا۔ مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے احترام آدمیت کا جس طرح گلا گھونٹا، اس کی بڑی مثالوں میں گذشتہ تین سو برس کے دوران اس کا سامراجی عمل سب کے سامنے ہے۔ بیسویں صدی میں پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کا ریکارڈ بھی نظروں سے اوجھل نہیں۔ ویت نام، افغانستان، فلسطین، مشرقی یورپ، چینی ترکستان اور جنگ خلیج (۱۹۹۱) کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ مگر سابق یوگوسلاویہ جیسی مارکسی ریاست کے سرب بیٹوں نے اشتراکی اقتدار سے آزادی پاتے ہی، بوسنیا ہرزے گونیا جیسی لبرل سی مسلم ریاست کے شہریوں پر جو مظالم ڈھائے، انھوں نے سبھی کو مات کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس قوم (یعنی مسلمانوں) سے سبھی "انسانیت دوستوں" کو خون کی بو آتی ہے، اس قوم نے خون دیا، مظالم برداشت کیے، دفاع بھی کیا، پھر ان پر روا رکھی جانے والی ظلم و درندگی کی داستانوں نے پتھر دل انسانوں کی آنکھیں پرنم کر دیں۔ مگر پوری دنیا میں مسلمانوں کے کسی ملا، مولوی یا بنیاد پرست نے اس بنیاد پر انتقام کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ نہ کسی گرجے کو نقصان پہنچایا اور نہ کسی کمیونسٹ کا بال بیکا کیا۔ ساتھ ہی مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر کیا کیا مظالم نہیں توڑے جا

رہے ہیں' مگر مسلمانوں نے کسی عام ہندو یا پنڈت سے انتقام نہیں لیا۔ یہ چیز دراصل اسلامی یا دینی اخلاقیات کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے' جس کی ناقدری کرنا بذات خود انسان دشمنی ہے۔

ایک بات بڑے اعتماد اور زور سے کہی جاتی ہے کہ "مارکس بے چارہ تو بے قصور ہے' مارکس ازم فی نفسہ انسانیت کا علم بردار ہے' مگر یہ لینن اور اسٹالن تھے' جنھوں نے اسے خراب کر کے نافذ کیا"۔ یہ بات محض عذر لنگ کے مترادف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مارکس ازم کی بنیاد میں وہ جوہری خرابی تھی' جسے ہر دو اشتراکی "عالم" اور "مجتہد" بھی دور نہ کر سکے۔ ان تعلیمات کے نتیجے میں وہی کچھ ہونا تھا' جو ہو کر رہا۔ فرض کیجیے' کہ اگر جوزف اسٹالن' ولادی میر لینن اور ماوزے تنگ جیسے "کم فہم مارکس پسندوں" نے ہی مارکسی چشمہ صافی کو گدلا کیا تھا' تو پھر دنیا بھر میں مارکس کے عشاق' اس کی تعلیمات کے حافظوں' محافظوں اور متن کو سبقاً سبقاً پڑھنے والوں میں سے کسی قابل ذکر فرد کو بغاوت کر کے سامنے آنا چاہیے تھا۔ انھیں ڈنکے کی چوٹ پر فکر مارکس سے بے رخی پر تڑپنا اور دوسروں کو تڑپانا چاہیے تھا۔ مگر ایسی آواز' کسی جید مارکسی عالم نے بلند نہیں کی۔ بلکہ سبھی مارکسی حضرات ان محدود یا لامحدود اجتماعی فوائد کو مارکس کی تعلیمات پر صدق دل سے اعتقاد رکھنے اور قوت عمل کو تیز کرنے کا پھل قرار دیتے تھے۔

ہمیں مسلم دنیا کے عام سیکولر بلکہ خود دینی تعلیمی اداروں میں بھی قرآن اور حدیث کی تعلیم اس ہمہ گیر انداز سے نہیں دی جاتی' جس زبردست انداز سے مارکس کی تعلیمات' اس کے متن کے ساتھ اشتراکی ممالک میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ کسی جید اور راسخ العقیدہ کیمونسٹ نے یہ اعتراض زوال اشتراکیت تک نہیں اٹھایا کہ "مارکس صاحب کے تعلیمات' افکار یا بنیادی کتب "سرمایہ" اور فکری امتزاج "منشور" کو نظرانداز کر دیا گیا ہے"۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ آدھا' پونا نہیں بلکہ پورا کارل مارکس اپنی تعلیمات اور تحریروں کے زور پر اشتراکی دنیا میں موجود رہا۔ اس کے باوجود انسان دوست مارکس کی تحریروں سے یہ ندا کیوں نہ بلند ہوئی کہ "مجھے میرے دوستوں بلکہ گورکنوں سے بچاؤ"۔ سائنس اور سماجیات کا ہر ذہین طالب علم اپنے ارد گرد لینن ازم' اسٹالن ازم اور ماؤازم کی شکل میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' اسے مارکس ازم کا عملی روپ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے مارکس ازم کے ان متوالے ممالک میں جب مزدوروں اور پسے ہوئے طبقوں نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور ان مجبوروں کے قدموں کی دھمک سے دھرتی کا دل دہلنے لگا' تو ہمیں کہیں کسی کونے سے بھی یہ آواز سنائی نہیں دی کہ "اصلی مارکس ازم نافذ کرو" یا "ہمیں ہمارا مارکس دو"۔ نہیں' بلکہ یہ لوگ مارکس کی تصویر پر تھوکتے' لینن اور اسٹالن کے مجسموں کو جوتے مارتے دکھائی دیتے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں نے سرخ پرچم کے سائے تلے ہی آنکھ کھولی تھی' انھوں نے مذہب کی "افیون" چکھی تک نہ تھی' مگر انھوں نے اپنے لہو کا وہ ذائقہ ضرور چکھ لیا تھا' جسے ان کے ہم وطن مارکسی ان کے جسموں سے

نچوڑ رہے تھے۔

مارکسی تعلیمات اور تشریحی جملے کتنے ہی خوب صورت ہوں، اور ان تعلیمات کے زیر اثر معرض تخلیق میں آنے والی تحریریں کتنی ہی خوش نما کیوں نہ ہوں۔ ان پر سر دھننے کے بجائے ہم یہ دیکھیں گے، کہ ان تعلیمات کے زیر سایہ جو ریاست وجود میں آئی، وہ انسان دوستی پر مبنی تھی یا انسانیت دشمنی پر استوار؟---
اس میں کیا شک ہے کہ اس اشتراکی ریاست کے وجود سے غیر اشتراکی دنیا کے صنعت کاروں، مہاجنوں، جاگیرداروں اور تاجروں پر ایک دہشت طاری تھی، جس کے نتیجے میں وہ ظلم کا راستہ اختیار کرنے کے باوجود کچھ ہچکچاتے اور ڈرتے تھے۔ انقلابیوں کی راہ روکنے کے لیے انھوں نے فلاحی ریاست اور سوشل سیکورٹی جیسے پروگرام شروع کیے۔

مگر جوں ہی اشتراکی روس زوال پذیر ہوا، نج کاری کے نام پر سرمایہ دار، پوری قوت سے اٹھا اور محنت کش اور عام صارف کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے لیے میدان میں کود پڑا۔ آج، منڈی کی معیشت اور نج کاری کے ہاتھوں انسان تڑپ رہے ہیں، مگر چند صنعتی ممالک، پانچ ارب انسانوں کا لہو نچوڑ رہے ہیں، مگر کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ اس صورت حال میں واقعی سوویت یونین کا وجود اپنی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اپنی فطرت کے اعتبار سے اس کا وجود انسانی فطرت سے ٹکراتا اور محض ایک دہشت کی علامت تھا اور دہشت کبھی بھی اعلیٰ قدر کے طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔ اس دہشت نے اگر فائدہ پہنچایا بھی تھا، تو فیض یاب ہونے والوں کو اس فائدے کی بہت بڑی قیمت چکانا پڑی تھی۔ لاکھوں انسان مارے گئے اور کروڑوں افراد محکومی کی زنجیروں میں جکڑے دم توڑ گئے۔ وہ لہو جو اشتراکی انقلابوں کو برپا کرنے کے لیے بہا، اور وہ خون جو اشتراکی انقلابیوں کو بچانے کے لیے بہایا گیا، بنیادی طور پر اس لیے تھا کہ "انسان کو معاشی استحصال سے بچانا ہے"۔ اس اعتبار سے اتنی بڑی انسانی قربانی لینے والوں سے، ہر بریدہ سر یہ سوال کرتا ہے کہ "ہمارے سروں کی فصل کاٹنے والو، تم نے ہماری اولادوں کو کیا دیا ہے؟" اس سوال کا مخاطب ہر کامریڈ ہے اور اس سوال کا مخاطب ہر مادہ پرست ہے۔ جن کے "مقدس اتحاد" نے نعروں اور سرابوں کی شدادی جنت آباد کی۔ مگر پوری دنیا کو سیاسی اور معاشی غلامی کے سوا کچھ نہ دیا۔

اشتراکیت کے انہدام کے بعد مارکسی تعلیمات کے حافظ اور اشتراکی تحریکوں کے علم بردار حضرات کا شعور مادہ پرستی کے دیوتا، ڈالر کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر رہ گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کے نمایندہ مارکس کا عطا کردہ سارا فہم [دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) کی یاد تازہ کرتے ہوئے] مغربی استعماریوں، خاص طور پر امریکہ اور اس کے آلہ کار اداروں کی خدمت میں صرف ہونے لگا ہے۔ آج منڈی کی معیشت کی کالی دیوی انسانیت کی تذلیل کر رہی ہے، مگر مارکسی تعلیمات کے محافظ ذرا رک کر بھی ان مقہوروں اور مظلوموں کی

خیریت دریافت نہیں کرتے۔ ان کا قلم، قومی اور اجتماعی مفاد کی تحریکوں کے خلاف چلتا ہے۔ ان کی دانش، ہم وطنوں کے تڑپنے پر لطف اندوز ہوتی ہے۔ وہ اپنے بھائی بندوں پر نازل ہوتی ہوئی کثیر قومی، مالی اور سیاسی سامراجیت میں اپنا فائدہ دیکھتے اور نشہ ترقی میں شانت ہوتے ہیں۔ مزدور یونینوں کا وہ تصور جو حقوق کے حصول کا موثر پلیٹ فارم تصور ہوتا تھا، اور جس کی سرشت میں طبقاتی جدوجہد کا جذبہ موج زن تھا، آج ظلم، زیادتی، استحصال، بے روزگاری، تالہ بندی اور ملازمتوں سے بے دخلی کی اس کالی آندھی میں بے وزن ہو کر رہ گیا ہے۔ کم و بیش ہر جگہ پر اس کی قیادتیں مفادات پرست مسخروں کا روپ دھار چکی ہیں۔ ان کی آواز میں وہ طنطنہ نہیں، جبکہ تڑپتا ہوا مزدور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور خون تھوکتا نظر آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا کہ یہ "مزدور قیادت" الٹا اپنی برادری کے خلاف چپکے چپکے وعدہ معاف گواہ بن گئی۔ حالانکہ انھوں نے مارکسی امرت پیا تھا۔۔۔ ان ہولناک لمحوں میں واقعی مارکس ازم کی دہشت اور مارکس کی انسان دوستی کے نعرے یاد آتے، مگر ان نعروں کی دل ہلا دینے والی گونج، اڈتے ہوئے سرخ پھریرے اور مظلوموں کی دست گیری کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ چیز مارکس کی فکر میں انسان دوستی کے لازوال جذبے کے عدم وجود کا پتا دیتی ہے۔

"مارکس کی تعلیمات میں اگر مذہب کا پیوند لگا دیا جائے تو یہ فکر آب حیات بن سکتی ہے" یہ محض ایک سادہ لوحی کی بات ہے۔ مارکسی تعلیمات کے تمام دھاروں اور مکمل عناصر ترکیبی کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے، تو ان میں سے کم و بیش ہر عنصر ایک منفی دائرے کی طرف جاتا ہے، جو انسانی فطرت سے دور ہے۔ اس لیے مذہب، مودت اور احترام آدمیت کی کوئی قدر اس سے لگا نہیں کھا سکتی۔ بلکہ مارکس ازم سراپا ان سے الجھتا اور ٹکراتا ہے۔ مثال کے طور پر "نظریہ قدر زائد" کو لیجیے۔ اسلام ضروریات زندگی سے زیادہ چیز کو رضاکارانہ طور پر انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے چھوڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وراثت، زکوٰۃ اور حرمت ربا کی تلقین کرتا ہے۔ جبری طور پر انسانی فطرت کی گردن نہیں مروڑتا، علٰی ہذا القیاس۔ اسی طرح آج یورپ میں ہمیں انسانوں سے ہمدردی کے جو جزیرے دکھائی دیتے ہیں، یہ انقلاب فرانس یا مادہ پرستی کے سیلاب کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس کا بنیادی سبب مسیحی تعلیمات کا اثر و نفوذ ہے۔

یہ کوئی بڑی دلیل نہیں کہ مارکس ازم میں مذہب کا پیوند لگانے کی خواہش یا حسرت کا اظہار علامہ اقبال نے کیا تھا۔ درحقیقت اقبال امید کے شاعر تھے۔ وہ ہر چیز کے مثبت پہلو پر نظر رکھتے تھے، اس لیے جہاں کہیں سے اچھی خبر ملتی، وہ اس پہ مسرت کا اظہار کرتے۔ پہلے پہل مصطفٰی کمال پاشا کی کامرانیوں سے انھیں امید پیدا ہوئی، تو انھوں نے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اسے پسند فرمایا۔ لیکن جب کمال ازم اپنے اصل روپ میں سامنے آیا، تو انھوں نے اس سے برات کا اعلان کیا۔ اسی طرح مارکس اور لینن کی کاوشوں سے انھیں

زیردستوں اور پسے ہوئے طبقوں کی بہتری کا رستہ نکلتا دکھائی دیا تو انھوں نے جوش و ولولے سے بھرپور اشعار میں ان کا تذکرہ کیا۔ لیکن جب اشتراکیت کا اصل رنگ سامنے آیا تو آخری عمر میں انھوں نے اس سے مکمل مایوسی کا اظہار کیا۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یہ طرز عمل ان کی صاف گوئی، تعصب سے لاتعلقی اور کھلے دل ودماغ کی علامت ہے۔ ہمیں فکر اقبال کو کسی اصول پر منطبق کرتے ہوئے، نہ صرف متن اقبال کے سفر کو بلکہ ان سماجی و سیاسی حالات کے ارتقا کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔ ویسے بھی کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے یہ بات فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتی کہ علامہ اقبال، قائداعظم یا مولانا مودودی رحمہم اللہ نے یہ کہا تھا۔ اصل چیز قرآن و سنت ہے کہ جس کسوٹی پر ان اور ان سے پہلے تمام رجال کار کے افکار کو پرکھا جائے گا۔ کیونکہ ہمارے لیے حقیقی حکم وہی ہے اور خود مذکورہ تینوں عظیم شخصیات نے خود مفتی یا مجتہد ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ اس لیے جب کبھی بھی مارکس ازم، سوشل ازم، جمہوریت، سیکولر ازم وغیرہ پر بات کی جائے گی تو محض ان حضرات کے کلام کو حرف آخر سمجھ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز، اسلام، جمہوریت، خرد مندی اور خود ان کی تعلیمات کے منافی ہے۔

اس لیے عرض ہے کہ مارکس کی انسان دوستی کے بارے میں، ان کے تمام افکار، ان کی تحریک، اس کے چلن، طور اطوار اور اس کے افکار سے پھوٹنے والے برگ و بار کو دیکھ کر ہی کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، محض ہریالی دیکھ کر اس کی فطرت کے بارے میں کوئی بات طے نہیں کی جا سکتی۔

انسانی فطرت میں ردعمل ایک نہایت قوی جذبہ ہے۔ مارکس ازم اپنے داخلی تضادات اور چند در چند خارجی محرکات کے باعث ناکامی سے دوچار ہوا۔ تاہم اس ناکامی کو حتمی چیز سمجھ لینا ایک غلط نتیجہ ہے۔ اصل میں مارکس ازم اور آج کا سرمایہ پرست مغرب (اور اس کا حلیف مشرق بعید) ایک ہی مادہ پرست تہذیب کے دو رخ ہیں۔ ان کے درمیان الحاد، اباحیت پسندی اور مادہ پرستی پر مبنی اتحاد اور مادی مفادات پر کش مکش کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہے گا، کیونکہ آج کا "سرمایہ دارانہ کلب" پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط، طاقت ور اور وسعت پذیری کی صلاحیت میں خوفناک ہے۔ مگر آخری تجزیے میں اسے بقا اور دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے، آخر میں ایک اہم سوال قابل غور ہے (خصوصاً ان لوگوں کے لیے، جو بجا طور پر اسلام کو عدل اجتماعی کی بہترین صورت تصور کرتے ہیں، اور خلوص نیت سے اس کے نفاذ کی

جدوجہد کر رہے ہیں) کہ وہ بنی نوع انسان کو اس شیطانی چکر سے نکالنے کے لیے، کب اور کس طرح آگے بڑھیں گے؟ انسانی تہذیب اور تاریخ میں بے مغز تقریروں، جذباتی نعروں، بے روح جلوسوں، بدلتے موقف اور کم مایہ تحریروں سے نہ پہلے کوئی معرکہ سر ہوا ہے، اور نہ آیندہ کوئی معجزہ رونما ہو گا۔ پختہ ایمان، اعلیٰ کردار، ٹھوس علمی کام، گہرے سماجی مشاہدے، کھلے ذہن اور جہد مسلسل کے بغیر یہ کام ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ عالم اسلام میں دین کو بے عملی کی علامت بنانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کے مطابق اس کے اخروی تصور، روحانی، سماجی، معاشی اور عدالتی نظام کو پیش کرنے والے افراد بھی اگر بے عملی میں ڈوبے، افراط و تفریط میں جکڑے اور کسی مثیل مہدی کی آمد کے منتظر بیٹھے رہیں گے، تو دنیا کے اسٹیج پر ایک کے بعد دوسرا ظالم جلوہ گر ہوتا رہے گا۔ اشتراکی روس کی ناکامی کے بعد امریکہ کی کامیابی، اور امریکہ کے زوال کی صورت میں یورپ یا مشرق بعید کی کامیابی سے خوش ہونے میں بھلا انسانیت کو کیا فائدہ ہو گا؟ یہ سب، ظلم کے ڈرامے کے مددگار کردار ہیں۔ جن کی منزل محض مادی مفادات کی جنگ ہے، استعماریت ہے اور شکار عام انسان ہے۔ کیا اس عام انسان کی دست گیری کے لیے، اسلام کا عادلانہ، انقلابی اور حقیقی تصور رکھنے والے لوگ بھی صرف اسی پر قناعت کریں گے، کہ ایک ظالم کی ناکامی اور دوسرے ظالم کی کامیابی کو وہ اپنی کامرانی تصور کریں؟

صلوا علی ترجمان القرآن! مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد کی خصوصی تحریر آیندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

قارئین اور ایجنسی رکھنے والوں کی خدمت میں

ترجمان القرآن کا پیغام نئے اور وسیع تر حلقے میں پہنچانے کے لیے آپ کی کوشش سے سالانہ خریداروں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ سب کوشش کریں، اپنے حلقہ تعارف میں ذکر کریں، پڑھنے کے لیے دیں تو بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ آپ سے سرگرم تعاون کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔

۵ سالانہ خریدار بنانے پر ڈائری اور **۱۰** بنانے پر وال کلاک پیش کیا جا رہا ہے۔

منتظم ترجمان القرآن

اخبار امت

الجزائر: ہاں یہ قتل ہم نے کیے!

مسلم سجاد

برادر مسلم ممالک الجزائر میں بے گناہ اور معصوم بچوں' عورتوں اور مردوں کا قتل عام جاری ہے۔ کسی علاقے میں کچھ مسلح گروہ داخل ہوتے ہیں اور کلہاڑیوں اور چھروں سے پورے علاقے کو مقتل بنا دیتے ہیں' بچوں کے سر دیوار پر دے مارتے ہیں اور خواتین کی آبروریزی کرتے ہیں۔ گھر کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ رمضان المبارک کے پہلے عشرے میں ایک ہزار سے زیادہ افراد قتل ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ ۵ سال قبل اسلامی فرنٹ کو انتخابات میں کامیابی کے پھل سے محروم کر کے فوج کے برسراقتدار آنے کے بعد شروع ہوا ہے اور اب تک اندازوں کے مطابق ایک لاکھ شہری مارے جا چکے ہیں۔ حکومت انتہائی ڈھٹائی سے اس کا الزام بنیاد پرستوں کی دہشت گردی پر رکھتی ہے' جبکہ جن علاقوں میں یہ بہیمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں' فرنٹ کے حامیوں کے ہوتے ہیں۔ دارالحکومت کے قریب کے علاقوں میں اور فوجی بیرکوں کے نزدیک قاتل کام کر کے چلے جاتے ہیں' نہ کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے' نہ آج تک کسی کو سزا ہوئی ہے۔ یہ سلسلہ جاری تھا۔ انسانی حقوق کی کسی بین الاقوامی انجمن کو اس پر توجہ کی توفیق نہ ہوئی' نہ کسی مسلم تنظیم نے حقائق جاننے کی کوشش کی' لیکن اب کچھ عرصے سے یہ صورت حال بین الاقوامی خبروں کا موضوع بن گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے دلچسپی لی' بیان آئے' برطانیہ اور یورپی برادری نے تحقیقاتی مشن بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ بھی اس لیے ہے کہ امریکہ' الجزائر میں فرانس کے بجائے اپنے اثرات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے قتل عام کے حقائق عالمی میڈیا پر آنے شروع ہوئے ہیں۔ مسلم ممالک کی حکومتیں تو شاید اپنے گھروں کی طرف دیکھتی ہیں تو خاموشی ہی کو بھلا سمجھتی ہیں کہ ایک دوسرے کے معاملات میں یہ دلچسپی' خود اپنے دامن تک نہ پہنچ جائے۔ صرف ایران کے صدر خاتمی نے کھل کر الجزائر کی حکومت کو متنبہ کیا ہے۔

نیوز ویک (۱۸ جنوری ۹۸) نے ایک الجزائری کالم نگار یاسر بن مولود کے مضمون پر کیا خوب عنوان لگایا ہے: It is the Generals, Stupid۔ یعنی کمال درجے کے احمق ہو کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سارا کھیل جنرلوں کا ہے۔ فوج نو آبادیاتی دور کی' سفاک اور اپنے عوام کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے والی ہے۔ قتل عام کے بعد گاؤں کے گاؤں خالی ہو جاتے ہیں اور زمینیں فوجی جنرلوں کی ملکیت میں آ جاتی ہیں۔ تیل کے

چشمے صحرا کے قریب ہیں، وہاں کوئی دہشت گردی نہیں ہو سکتی۔ اس سے خزانے میں آمدنی جاری ہے۔ کالم نگار لکھتا ہے کہ امریکہ چاہتا تو مافیا طرز کی حکومت نے جو انتخابی فراڈ کیے، ان کے خلاف میدان میں آ جاتا لیکن اس نے سب کچھ ہونے دیا ہے۔ اب بھی وہ بس حکومت کو ملزم قرار دے رہے ہیں، قتل عام جاری ہے، یہ جاری رہے گا، جس طرح بین الاقوامی منافقت جاری ہے۔

حقائق کیا ہیں؟ اب پردہ اٹھنا شروع ہوا ہے۔ آج کی دنیا میں حقائق کو جاننا ایسا مشکل بھی نہیں کہ بڑی طاقتوں کی دلچسپی کے بغیر، مسلمانان الجزائر کے پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے بھائی ان پر پڑنے والی بپتا کو نہ جان سکتے، لیکن امرواقعہ یہی ہے کہ ہم کو بھی مغربی ذرائع سے ہی اطلاعات مل رہی ہیں۔

برطانیہ کے اخبار دی آبزوور کی ۱۱ جنوری ۹۸ کی اشاعت میں جان سوینی نے دو ایسے افراد کے انٹرویو شائع کیے ہیں جنھوں نے حکومت کے کارندوں کی حیثیت سے الجزائر میں قتل عام میں حصہ لیا ہے، بھاگ کر برطانیہ آئے ہیں۔ وہ اب اعتراف جرم کرتے ہیں۔ انھیں کس چیز نے اس طرح کی کارروائی میں حصہ لینے پر مجبور کیا؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم حکم نہ مانتے تو ہمیں خود قتل ہونا پڑتا، ہمارے اہل خاندان کی بھی خیر نہ تھی۔

نیم فوجی تنظیم کے اس اہلکار نے گذشتہ سال ۱۰ اکتوبر کے قتل عام کے بارے میں بتایا: ''ہم ۱۸ گاڑیوں میں تھے، ہر گاڑی میں ۴ سپاہی۔ ہم رات ڈیڑھ بجے اپنے پولیس اسٹیشن سے روانہ ہوئے جو مرکزی الجزائر میں شہر قصبہ سے ۳ میل دور واقع ہے۔ ہم پون گھنٹے میں مضافات کے علاقے راس جندوو پہنچ گئے۔ جو مکان ہدف تھا ہم اس کے قریب پہنچ کر رک گئے اور ملٹری سیکورٹی کی اسپشل فورسز کا انتظار کیا۔ جیسے ہی وہ پہنچے ہم میں سے ایک نے علاقے کی بجلی کی فراہمی منقطع کر دی جس سے ۲۰، ۳۰ مکان مکمل اندھیرے میں آ گئے۔ بجلی کاٹنا ہمارا کام ہوتا ہے۔ ہمارے لیے واضح احکامات تھے۔ ہمیں آس پاس کے علاقے پر نظر رکھنا تھی اور احکامات کے بغیر کارروائی نہیں کرنا تھی۔ ملٹری سیکیورٹی کے سپاہی دو گھنٹے سے کچھ کم یا زیادہ وقت میں واپس آئے۔ جب وہ چلے گئے تو ہم جگہ صاف کرنے گئے۔ دو خاندانوں کی سولہ لاشیں تھیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھیں، ایک تو بالکل ننھا بچہ تھا--- سب کے گلے کٹے ہوئے تھے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ کیا منظر تھا!''

الجزائر میں قتل عام کون کر رہا ہے؟ دونوں اہلکار ایک ساتھ بول پڑے: ''یہ ہم کر رہے ہیں''۔ دونوں کی شہادت الجزائری حکومت کے اس سرکاری موقف کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے کہ مسلمان بنیاد پرست اس قتل عام کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں نے تفصیلی شہادت فراہم کی کہ کس طرح ریاست منظم جنگی انداز سے خود ڈیتھ اسکواڈ کے ذریعے قتل، حکومت کے مخالفوں پر بدترین ٹارچر، جاسوسی، ''مشکل'' صحافیوں کے قتل اور بعض مقبول فن کاروں کے قتل (تاکہ اسلامسٹوں کو بدنام کیا جا سکے) میں ملوث ہے۔

''اینڈریو'' نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں پولیس میں آنے سے یہاں آنے تک، میں نے ہر کام کیا ہے، قتل، ٹارچر۔ میں نے ٹارچر دیکھا ہے اور کیا بھی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ۱۹۹۲ میں ٹارچر دیکھا جب ہم نے

اسلامک فرنٹ کے ایک سرگرم کارکن کو گرفتار کیا۔ فوجی حکام نے مجھ سے کہا: "تم آکر دیکھ سکتے ہو' اگر تم دیکھ سکو تو"۔ (پھر ٹارچر کا بیان ہے جو یہاں نقل کرنے کا یارا نہیں ہے)

الجزائری حکومت ٹارچر کی ان کارروائیوں کی تردید کرتی ہے لیکن ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کا کہنا ہے کہ یہ منظم طور پر ہو رہا ہے اور ان کے پاس ایک کے بعد ایک کیس کی رپورٹیں ہیں جن میں تفصیل سے ٹارچر کا بیان کیا گیا ہے۔

"رابرٹ" نے قتل کے دو بڑے واقعات میں اپنا حصہ بیان کیا۔ ۱۹۹۴ میں عین دیلا کے پہاڑی علاقے کے بارے میں بتایا گیا کہ یہاں اسلامسٹوں کا ایک گروپ سرگرم ہے۔ وہاں لوگ سادہ زندگی گزارتے ہیں' بہت غریب ہیں۔ ہم نے حکم ملنے پر گاؤں پر کلاشنکوف سے فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں کوئی فائرنگ نہ ہوئی۔ جب فائرنگ روکنے کا حکم ہوا تو ہم گاؤں کے اندر گئے۔ وہاں صرف عورتوں اور بچوں کی لاشیں تھیں۔

دوسرا واقعہ ۱۹۹۵ کے آخر میں لاربا میں پیش آیا۔ ہم سے کہا گیا کہ ملٹری سیکیورٹی کا انتظار کریں۔ وہ آئے تو انھوں نے اسلامسٹوں کے سے ڈھیلے پتلون پہن رکھے تھے' نقلی ڈاڑھیاں لگا رکھی تھیں۔ ان کے افسر نے ہم سے کہا کہ گھیرا ڈال کر انتظار کریں۔ دو گھنٹے بعد وہ ہاتھ پونچھتے ہوئے واپس آئے۔ پھر ہم اندر گئے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا' یقین نہ کر سکتے تھے۔ عورتیں' بچے سب ذبح ہوئے پڑے تھے۔ اتنی زیادہ تعداد میں' کہ گنے نہ جا سکتے تھے۔ میں نے ہر گھر میں کٹے ہوئے گلے اور سر جسم سے جدا دیکھے۔ میرے ذہن میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کرنے والے ملٹری سیکیورٹی کے افراد تھے"۔

اینڈریو کا ایک کام صحافیوں کی نگرانی تھا تاکہ وہ حکومت پر تنقید نہ کریں۔ اینڈریو کا کہنا ہے کہ جو صحافی لائن کے مطابق نہ چلتے تھے' قتل کر دیے جاتے تھے اور الزام اسلامسٹوں پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس نے بتایا:

"میرا ایک چچازاد بھائی صلاح بن شہرا اے پی ایس کا رپورٹر تھا۔ جب وہ تیونس میں تھا' اس نے حکومت کے خلاف کچھ لکھا۔ یہ کیس میرے پاس تھا۔ میں نے اس کے جملے نوٹ کیے جو آر بی کے (RBK) فائل میں چلے گئے۔ صحافیوں پر سب رپورٹیں اس فائل میں جاتی ہیں۔ یہ پولیس کے سربراہ کے پاس چلی جاتی تھیں جو وزارت داخلہ کو بھیج دیتا تھا۔ بن شہر کو ۷ ۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو جنوبی قصبہ بوفارق میں اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ کام سے واپس آ رہا تھا۔ کسی نے ذمہ داری قبول نہ کی۔ ایک امریکی رپورٹ کے مطابق یہ کام مسلح اسلامی جنگجوؤں کا سمجھا گیا لیکن اینڈریو نے کہا: "میں جانتا ہوں اسے کس نے قتل کیا۔ یہ ہمارے ساتھی تھے"۔

دونوں کا کہنا ہے اگر کوئی تحقیقاتی مشن الجزائر جائے تو ٹارچر کی ان جگہوں (complexes) کا ضرور معائنہ کرے: ۱۔ شناف بیرکوں کا تہہ خانہ' ۲۔ بن اخنون چڑیا گھر میں تہہ خانہ' ۳۔ بن میسوس کا ٹارچر ہاؤس' ۴۔ پولیس ہیڈ آفس کا تہہ خانہ۔

حضرت ابو امامہ ایاس بن ثعلبہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی مسلمان کا حق مارا' اللہ نے اس پر آگ واجب کر دی اور جنت حرام کر دی۔ ایک آدمی نے پوچھا: اگرچہ کوئی بالکل معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں' اگرچہ ایک پیلو کی لکڑی ہو"۔

(مسلم)

رسائل و مسائل

تقریر میں قسم اٹھانا

ایک پوسٹر میں ایک جملہ: ''شہداے بدر و احد و حضرات عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ و حسینؓ کے لہو کی قسم'' استعمال کیا گیا ہے۔ ایک صاحب کے بقول یہ شرک کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی علمی راے کا طالب ہوں۔

قسم کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک شرعی اور دوسری لغوی۔ شرعی قسم میں ایک کام کو کرنے کے لیے عزم کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی ایسی ذات کی قسم اٹھائی جاتی ہے جسے نفع و نقصان کا مالک اور دور و نزدیک سے مدد کے لیے پہنچنے پر قادر سمجھا جائے۔ اس عقیدے کے ساتھ تعظیماً قسم اٹھائی جائے اور قسم کا مقصد یہ ہو کہ کام کو لازماً کیا جائے گا کہ اس کام کے کرنے پر عظیم ذات کی قسم اٹھائی گئی ہے۔ نیز قسم کو توڑنے کا خوف ہو اور یہ سمجھا جائے کہ قسم توڑ دی گئی تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس طرح کی شرعی قسم تو اللہ اور اس کی صفات کے علاوہ کسی دوسری ذات کی نہیں اٹھائی جا سکتی اور اگر کوئی اٹھائے گا تو شرک کا مرتکب ہو گا۔

دوسری قسم لغوی ہوتی ہے جس میں **مقسم بہ** کے متعلق وہ عقیدہ بھی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتا ہے' نہ ہی اس طرح کی قسم اس لیے اٹھائی جاتی ہے کہ اسے توڑا نہ جائے اور نہ ہی خلاف ورزی پر کوئی کفارہ ہو۔ غیراللہ کی اس طرح کی قسم شرک نہیں ہے بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قسم ثابت ہے۔ آپؐ نے متعدد مواقع پر **وابیہ** ''اس کے باپ کی قسم'' کے کلمات استعمال کیے ہیں۔ اس لیے مسئولہ کلمات یا قسم کے لیے اس طرح کے دوسرے کلمات کے بارے میں کوئی حکم لگانے سے پہلے متعلقہ شخص سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے یہ قسم کس نیت سے اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں اس کے عقائد و افکار کو بھی دیکھا جائے' اس کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ اس نے شرک کیا ہے یا نہیں۔ ماضی میں' جو کچھ ہو چکا' اس کے بارے میں مذکورہ اصول کو اپنایا جائے' اور مستقبل کے بارے میں عمومی ہدایت یہی کی جائے کہ لوگ غیراللہ کی لغوی قسم سے بھی پرہیز کریں کہ غیراللہ کی لغوی قسم اس کی شرعی قسم کا بتدریج ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر اس طرح کا سلسلہ بلاروک ٹوک جاری رہا تو پھر لغوی اور شرعی قسم میں فرق اور امتیاز ختم ہو جائے گا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نبیؐ کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سب سے اچھا جواب وہ ہے جو علامہ چلپی

نے مطول کے حاشیے میں **ولعمری** "مجھے اپنی عمر کی قسم" کے الفاظ پر اور علامہ شامی نے درمختار کے خطبہ پر گفتگو کرتے ہوئے دیا ہے کہ "یہ لغوی قسم ہے' شرعی نہیں"۔ پہلی (یعنی لغوی قسم) سے مقصود صرف کلام کی زینت ہوتی ہے' اس کے علاوہ کچھ اور مقصود نہیں ہوتا جبکہ دوسری (یعنی شرعی قسم) سے تاکید اور جس ذات کی قسم اٹھائی جاتی ہے' اس کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔ ممنوع دوسری قسم ہے' پہلی نہیں۔ اور نبی کریمؐ نے جو قسم اٹھائی ہے وہ پہلی ہے' نہ کہ دوسری۔ پھر بھی میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ سد ذریعہ کے طور پر مطلقاً منع کیا جائے تاکہ لوگ اس میں تساہل سے کام نہ لیں" (فیض الباری' ج ۱' ص ۱۳۹-۱۴۰)۔

اشتہار میں جو قسم اٹھائی گئی ہے اس سے میرے نزدیک کلام کی تزئین مقصود ہے۔ اسی لیے شرک نہیں ہوا' لیکن آیندہ کے لیے ہدایات دی جاتی رہیں کہ اس طرح کی قسموں سے بھی پرہیز کیا جائے۔ تقریر و تحریر اور پوسٹرز وغیرہ میں اس قسم کی عبارات استعمال نہ کی جائیں۔ واللہ اعلم! (**مولانا عبدالمالک**)

اسلام اور تصور جشن

میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں' ان کے جواب درکار ہیں:

۱- گولڈن جوبلی' سلور جوبلی' ڈائمنڈ جوبلی' پلاٹینم جوبلی--- کا اسلام میں کیا تصور ہے؟ ان رسومات اور جشن منانے کا پس منظر کیا ہے؟ کیا اسلام میں بھی فتح مکہ یا کسی اور آزادی کی جوبلی منائی گئی؟ لفظ جوبلی کا اصطلاحی اور لغوی مفہوم کیا ہے؟

۲- نبی کریمؐ یا خلفاے راشدین کے دور میں' کیا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ویزا اور اس قسم کی کوئی چیز تھی؟ اگر تھی تو اس کی شرائط کیا تھیں؟ اگر ویزا سسٹم رائج نہ تھا تو آج وہ ممالک جن کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں اسلامی قانون نافذ ہے' ان میں داخلے کے لیے ویزا کی پابندی کیوں ہے؟ غالباً قرآن حکیم میں ایسی کسی پابندی کی نشان دہی بھی نہیں کی گئی ہے۔ نیز ویزا کے حصول کے لیے اسلامی نقطہ نگاہ سے کیا شرائط ہو سکتی ہیں؟

پاکستان میں اس وقت جس اہتمام سے پچاس سالہ جشن منایا جا رہا ہے اور جسے گولڈن جوبلی کا نام دیا گیا ہے' اس حوالے سے آپ کا سوال دلچسپ بھی ہے اور آج کے مسائل سے تعلق بھی رکھتا ہے۔ انگریزی زبان میں لفظ jubilate کا مفہوم انبساط و خوشی کا اظہار ہے۔ jubilant وہ صفت انبساط ہے جو ایک فرد یا ماحول میں پائی جاتی ہے۔ البتہ لفظ Jubilee تاریخی طور پر یہودیوں کے سال نجات' بعض انبساطی تہواروں اور خصوصاً ہر پچاس سال پر ایک ایسے تہوار سے تعلق رکھتا ہے جس میں غلاموں کو آزاد کرنے اور زمینوں

کی ملکیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی قدیم عبرانی روایت پر عمل کیا جاتا تھا۔ گو عمومی طور پر کسی بھی پچاس سالہ تقریب کو گولڈن جوبلی اور ساٹھ سالہ تقریب کو ڈائمنڈ جوبلی سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ بظاہر اس رسم کا ماخذ قدیم یہودی روایات ہیں۔ عبرانی میں Yobel ایسے ساز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے گائے کے بچھڑے کے سینگ سے بنایا جائے اور جسے ایسی خوشی یعنی Jubilee کے موقع پر استعمال کیا جاتا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: Encyclopedia of Religion and Ethics; James Hastings، ج ۵، ص ۸۲۶، مطبوعہ نیویارک)۔

جوبلی کی مختلف شکلوں کو ایک لمحے کے لیے نظرانداز کرتے ہوئے یہاں جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ دراصل وقت کا تصور ہے جو بہت سے پرانے مذاہب میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ بعض کی نگاہ میں وقت کے بعض لمحات تقدس کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک افسانوی ذہن (mythological mind) وقت کے تقدس کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ وہ وقت کی گردش اور بعض لمحات کو عبادت، خوشی یا خوف سے وابستہ کر لیتا ہے جو اس کی نگاہ میں ایک مرکزی اہمیت رکھتے ہوں، مثلاً عیسائی یہودی، یا ہندو تہوار جن میں سے اکثر کا تعلق وقت کے اس تقدس کے پہلو کے ساتھ ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'The sacred and profâne; Mercea Eliade نیویارک Harcourt Brace)۔

اسلام دراصل ایسی تمام رسومات سے نجات کا نام ہے جو تاریخی عمل کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ہستی سے وابستہ کرتی ہوں۔ اسلام ایک رسومات شکن دین ہے۔ ہمارے علم میں قرآن و حدیث اور آثار میں کوئی ایسا حکم یا اشارہ نہیں ملتا جس میں صحابہ کرامؓ نے کسی خاص وقت یا لمحے کو مقدس سمجھتے ہوئے اس کو بطور تہوار منایا ہو۔ ہجرت مدینہ کا موقع ہو یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد، فتح بدر، حضورؐ کا اسراء و معراج پر تشریف لے جانا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت، یوم فتح مکہ غرض خلفاے راشدین اور صحابہ کرام کی کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص واقعہ، وقت یا لمحے کو مقدس قرار دے کر ہر سال یا ہر ماہ ایک مقررہ نظام الوقت کے ساتھ اسے بطور تہوار منایا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ہماری عیدین صرف دو ہیں: عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور ان کا تعلق کسی خاص مقدس وقت کے چکر (time cycle) کے ساتھ قائم نہیں فرمایا بلکہ یہ دونوں تہوار سال کے دوران مختلف موسم اور مہینوں میں گردش کرتے ہیں۔ ایسا کوئی واقعہ بھی نہیں ہے جس میں صحابہ کرامؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت یا یوم وصال پر کسی تقریب کا اہتمام کیا ہو یا تبع تابعین نے ایسا کیا ہو۔ نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ خلفاے راشدین نے ہجرت مدینہ کی اہمیت کے پیش نظر ہر سال یا ہر دس سال یا پچاس سال گزرنے پر کسی تقریب کا اہتمام کیا ہو۔

اگر تنقیدی نگاہ سے غور کیا جائے تو اس قسم کی تقریبات، تاریخی یا دینی مرتبہ و مقام عموماً تاریخ کے ایسے ادوار میں اختیار کر جاتی ہیں جب بعض روبہ زوال اقوام اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر کو خود اپنی ترقی سمجھنا شروع کر دیتی ہیں اور اس طرح کے نشانات منزل کو آگے بڑھنے کے بجائے ماضی کی طرف تحسین و تعریف سے دیکھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اقوام ماضی کے حسین لمحات کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی کم عملی اور پستی کو تفریحی سرگرمیوں کے زیر عنوان گم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر انبساط کے اظہار کے لیے نغمے، رقص، لذیذ کھانے، مشروبات وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ایک متعین "مقدس وقت" (sacred time) کو ایک تہوار کی شکل دے دی جاتی ہے۔

دوسری جانب نظر ڈالیے تو قرآن کریم اور نبی کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو تصور وقت دیا، اسے **سورۃ العصر** میں ایجاز [اختصار] کے ساتھ بیان فرما دیا گیا کہ جو لوگ وقت اور زمانے کی اہمیت کے قائل ہیں، جنھوں نے دہر کو بھی اپنا خدا بنا لیا تھا، وہ جان لیں کہ ہر انسان خسارے میں ہے سوائے اس کے جو اللہ پر ایمان لایا، عمل صالح کیا، اور **تواصی بالحق** اور **تواصی بالصبر** پر قائم ہو گیا۔ یہاں وقت کا ایک انقلابی تصور دے کر اسلام نے جاہلیت کے تمام تصورات کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ پھر یہ بات قابل غور ہے کہ ہم جس ہادی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کیا ان کے اسوہ میں کوئی مثال اس اسراف کی ملتی ہے جو ہم پچاس سالہ تقریبات کے عنوان سے کر رہے ہیں؟ ایسے پچاس سال کی تکمیل پر جن میں کامیابیوں کے مقابلے میں ناکامیاں زیادہ ہوں، یہ بات کہاں تک جائز ہے کہ احتساب نفس، تنقیدی جائزے اور مستقبل کے لیے حکمت عملی وضع کرنے کے بجائے اپنی ناکامیوں پر جشن منایا جائے؟

اگر فی الواقع ہماری تاریخ میں کوئی موقع جشن کا مطالبہ کرتا تھا تو وہ فتح بدر یا فتح مکہ کا موقع تھا۔ غور کیجیے فتح مکہ کے موقع پر جو بات فرمائی گئی، وہ کیا تھی؟ "جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ توبہ قبول فرمانے والا ہے" (**النصر ۱۱۰:۱-۳**)۔ غور کیجیے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی قوم کو جو باہمی منافرت، قبیلہ پرستی، اخلاقی پستی، تہذیبی و تمدنی انحطاط، معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل کا شکار تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تباہی کے گڑھے سے نکال کر اتحاد، اخوت اور خوشحالی و ترقی کے مقام پر پہنچا دیا اور جس مرکزی مقام سے آپؐ کو بے گھر کیا گیا تھا آخر کار آپؐ وہاں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ حق آگیا، باطل چلا گیا، بلاشبہ باطل جانے ہی کے لیے تھا--- لیکن اس کامیابی کو منانے کا جو طریقہ تجویز کیا گیا وہ یہ تھا کہ اپنے رب کی حمد، تسبیح و تہلیل کرو اور ساتھ ہی اپنی نادانستہ و دانستہ بھول پر اللہ سے استغفار طلب کرو۔ قرآن پاک نے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں فتح و کامیابی پر خوشی منانے کا جو طریقہ سکھایا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد، عبادات، نوافل و انفاق فی سبیل اللہ کو زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور اپنی بھول پر بار بار اللہ سے مغفرت طلب کی جائے۔ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے میں اس دھوم دھڑکے کی کوئی گنجایش نظر نہیں آتی جو بہت سے مسلمان اپنے ممالک میں بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں اور جن میں ہم بھی شامل ہیں۔

آپ کے دوسرے سوال کا تعلق خلافت راشدہ یا اس کے بعد کے ادوار میں مسلمان ممالک کے درمیان نقل و حمل کے ضوابط سے ہے۔ اصولاً ایک مسلمان مرد اور عورت کسی بھی مسلمان ملک میں داخل ہونے، سفر کرنے، قیام کرنے اور معاشرتی اور دیگر تعلقات پیدا کرنے کا بنیادی حق رکھتی ہے لیکن اگر باہمی اتفاق سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ سفر یا کسی ملک میں داخلے کے لیے کوئی دستاویز ساتھ ہو تو اس میں کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی نظر نہیں آتی۔ ہاں سفر کی شرائط ایسی ہونی چاہییں جو سیروا فی الارض کی قرآنی ترغیب و تعلیم پر عمل کرنے میں مزاحم نہ ہوں۔

اقساط پر خریداری

دور جدید کے مسائل کے بارے میں اجتہادی رہنمائی کے لیے بھارت میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے فقہی سیمی نار کا سلسلہ جاری ہے جس کی رپورٹیں شائع کی جاتی ہیں۔ دسواں فقہی سیمی نار، حج ہاؤس بمبئی میں ۲۴ تا ۲۷ اکتوبر ۹۷ منعقد ہوا، جس میں اوقاف، حج و عمرہ، کلوننگ اور اقساط پر خریداری کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ ہم ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ (جنوری ۹۸) کے حوالے سے **بیع بالتقسیط** کے بارے میں فیصلے پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

(۱) خرید و فروخت کے معاملے میں ادھار فروخت کی صورت میں بمقابلہ نقد قیمت کے اضافہ جائز و درست ہے اور اس طرح کی خرید و فروخت بھی درست ہے، بشرطیکہ معاملے کو مکمل کرتے وقت بات اس پر ختم کی جائے کہ یہ خرید و فروخت ادھار اتنی قیمت پر اور اتنی مدت کے لیے ہو رہی ہے۔

(۲) ادھار قیمت یکمشت ادا کی جائے یا چند حصوں و قسطوں میں، دونوں صورتیں درست ہیں۔

(۳) اس طرح کی خرید و فروخت کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ معاملے کو مکمل کرتے وقت قیمت متعین ہو جائے، ابتداء خواہ صرف ادھار قیمت کا ذکر کیا جائے یا نقد و ادھار دونوں کا۔

(۴) ادھار خرید و فروخت میں نقد معاملے کے مقابلے میں قیمت کی زیادتی، ربا کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید و فروخت میں جو بھی قیمت ہو، وہ مبیع یعنی خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے، اسی طرح ادھار خرید و فرخت کے مقابلے میں بھی طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے۔

(۵) متعینہ مدت میں قیمت یا قسط کے ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کسی طرح کی زیادتی کا مطالبہ اور معاملہ سود کے تحت داخل ہے، خواہ معاملہ کرتے وقت اس طرح کی شرط لگائی گئی ہو، یا بعد میں اس طرح کا مطالبہ کیا جائے۔

(۶) جس شخص نے بطور رہن کوئی سامان اپنے پاس رکھا ہو، اس کا رہن رکھے ہوئے سامان سے نفع اٹھانا سود ہے، جو کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

(۷) رہن کا سامان اگر رہن رکھنے والے کے پاس ضائع ہو جائے تو سامان کی قیمت اگر دین کے برابر ہے، تو کسی کے ذمہ کوئی حق نہیں رہا۔ اگر سامان کی قیمت کم ہے، تو دین کی قیمت باقی رقم دینے والے (جس کے پاس رہن تھا) کے ذمہ واجب ہو گی۔ اگر سامان کی قیمت زیادہ ہے اور رہن لینے والے کے عمل و لاپرواہی کو اس میں دخل ہے تو دین سے زیادہ قیمت رہن لینے والے کے ذمہ واجب ہو گی۔

(۸) دین کو وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض دار کو بار بار متوجہ کرنے کے بعد جب اس کا ٹال مٹول ظاہر ہو، قرض خواہ کو اجازت ہے کہ سامان کو واجبی قیمت پر بیچ کر اپنا حق وصول کر لے۔

(۹) قسط وار خرید و فروخت کی صورت میں فروخت کردہ سامان کو اگر بائع اس وقت تک کے لیے روکتا ہے جب تک کہ اس کو تمام قسطیں وصول نہ ہو جائیں، تو یہ درست نہیں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ فریقین یہ طے کر لیں کہ خرید کردہ سامان بطور رہن فروخت کنندہ کے قبضہ میں اس وقت تک رہے گا جب تک اس کی جملہ اقساط ادا نہ ہو جائیں۔

(۱۰) طے شدہ مدت تک بعض قسطوں کو ادا کر دینے کے بعد بقیہ قسطوں کے ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع (فروخت کنندہ) کو یہ حق نہیں ہے کہ فروخت کردہ شے کو واپس لے لے اور ادا کردہ قسطوں کو واپس نہ کرے۔

(۱۱) خرید کردہ سامان کو مشتری (خریدار) کے قبضہ میں دے کر رہن قرار دینا درست نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ خریدار سے بیچنے والا بطور رہن لے لے اور اس کے بعد پھر مشتری کو عاریتاً دے دے۔

(۱۲) کریڈٹ لیٹر کی اجرت کی بابت کمیٹی نے یہ طے کیا ہے کہ اس سلسلے میں مزید غور و خوض کیا جائے۔

(۱۳) قرض کی دستاویز (رسیدات، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہو جائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق، واجب رقم سے کم لے کر اس معاملے سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اس طرح کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

(۱۴) واجب الادا رقم کی مقدار کم کر کے فوری وصول کر لینا جسے "ضع و تعجل" کے الفاظ سے تعبیر

کیا جاتا ہے' اگر اصل معاملہ کوئی مدت اداء دین کی معین نہ ہو تو جائز ہے کہ یہ ایک طرح کا تبرع ہے' اور اگر مدت معین ہو تو اس طرح کا معاملہ جائز نہیں ہو گا کہ جس پر دین واجب ہے' وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الادا دین کو کم کرا رہا ہے۔

(۱۵) دین کی ادائیگی کے لیے طے شدہ مدت سے قبل دین کی ادائیگی کا مطالبہ جب کہ قسطیں وقت پر ادا نہ کی جا رہی ہوں' درست ہے۔ اس لیے کہ فریقین نے جو معاہدہ کیا ایک فریق نے اس کی خلاف ورزی کی تو دوسرے پر بھی اس کی پابندی لازم نہیں رہ گئی۔

(۱۶) جملہ اقساط کی ادائیگی سے قبل اگر مدیون (خریدار) کی موت ہو جائے تو بھی معاملہ علی حالہ باقی رہے گا' جیساکہ دائن کی موت کی صورت میں باقی رہتا ہے۔ بشرطیکہ بائع (دائن) اس پر راضی ہو۔

کتاب نما

انسان کاملؐ، ڈاکٹر خالد علوی۔ ناشر: الفیصل، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۶۷۸۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کے نزدیک سیرت نگاری کی غایت یہ ہونی چاہیے کہ: "فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے، جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو"--- ڈاکٹر خالد علوی کی زیر نظر کاوش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کا مقصد تحریر، اس مثالی انسان کو سامنے لانا ہے جن کی: "ذات گرامی، زندگی کے تمام دوائر کے لیے مکمل نمونہ ہے"۔ مصنف موصوف عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کے ماہر اور جامعہ پنجاب میں پروفیسر ہیں--- ان کے خیال میں اگر ہم اس مثالی انسان کی زندگی کو عملی طور پر اپنا لیں تو ہمیں عصر حاضر کی بے یقینی، عدم توازن، روحانی افلاس و اضطراب اور ذہنی پریشانیوں سے نجات مل سکتی ہے۔

زیر نظر کتاب ۲۳، ۲۴ سال پہلے تالیف کی گئی تھی۔ اب اسے نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ، زیادہ بہتر اور جامع صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ سوانحی کوائف و تفاصیل کے بعد آپؐ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نہایت عالمانہ انداز میں اجاگر کیا گیا ہے، یعنی بہ طور: تاجر، خطیب، مبلغ و داعی، معلم انسانیت، داعی انقلاب، مربی و مزکی، سپہ سالار، مدبر و منتظم، مقنن، منصف و قاضی، سربراہ خاندان، خلق عظیم اور رسول رحمتؐ وغیرہ--- مولف دیباچے میں لکھتے ہیں: "اس ہادی اعظمؐ کی روحانی و باطنی وسعتوں کی معرفت اور اس کی توضیح ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے لیکن اپنی بے بضاعتی کے باعث میں نے اسے نہیں چھیڑا۔ یہ کسی عارف و صوفی کا میدان ہے--- میں نے "انسان کاملؐ" کی سیرت کے ان گوشوں کا مربوط مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جن کا تعلق حیات انسانی کی مادی تنظیم سے ہے---" اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولف نے سیرت پاک کا زیر نظر مطالعہ کس زاویہ نظر سے پیش کیا ہے۔

مختلف مباحث میں قرآن و حدیث سے بکثرت استشہاد [حوالہ دینا] کیا گیا ہے۔ خوش آیند امر یہ ہے کہ آیات قرآنی پر بہ اہتمام اعراب لگائے گئے ہیں۔ فاضل مولف نے دیگر سیرت نگاروں اور بعض مستشرقین کے بیانات و آرا سے بھی اعتنا [استفادہ کرنا] کیا ہے۔ اردو زبان میں سیرت نبویؐ پر ایک مہتم بالشان [اہم] ذخیرہ وجود میں آ چکا ہے--- ڈاکٹر خالد علوی کی یہ کاوش روایتی انداز سے ہٹ کر اور وسیع تر ماخذات کی مدد سے لکھی گئی ہے اور یہ اردو ذخیرۂ سیرت کی اہم اور منتخب کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے--- طباعت و

اشاعت کا معیار اطمینان بخش ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

کیا ہم مسلمان ہیں؟، شمس نوید عثمانی۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶۔ [پاکستان میں: ادارہ مطبوعات طلبہ، ا-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور] صفحات: ۵۸۵۔ قیمت: ۱۴۰ روپے۔

شمس نوید عثمانیؒ (۱۹۳۱-۱۹۹۳) برصغیر کے عثمانی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا عامر عثمانی کی علمی و دینی میراث کے امین تھے۔ ماہنامہ "تجلی" دیوبند میں "کیا ہم مسلمان ہیں؟" کے مستقل عنوان سے مضامین لکھتے تھے۔ یہ مضامین بعدازاں تین جلدوں میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر اب ان سب کو یکجا صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ شمس نوید عثمانیؒ قرآن و سنت سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ سوز و گداز قلب اور مومنانہ فکر و نظر سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کی تحریروں کی بے پناہ تاثیر کی وجہ سے ان کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ملت اسلامیہ کے عصری حالات کے تناظر میں ان تحریروں کی کل بھی ضرورت تھی اور آج بھی ضرورت ہے۔ نہ صرف معنوی اعتبار سے مفید ہے بلکہ صوری اعتبار سے بھی۔ مجلد کتاب حسن و جمال سے بہرہ ور ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

ہندستان میں اسلامی تحریکیں، ڈاکٹر اقتدار محمد خان۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ صفحات: ۴۶۳۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

اس کتاب میں ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں اسلامی تحریکوں (جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، جمعیت العلماے ہند، دیوبند اور ندوۃ العلما) کے کام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کی وسعت مطالعہ اور دقت نظر نے ایک بڑے موضوع کو بڑی خوب صورتی سے سمیٹنے میں مدد دی ہے۔ انھوں نے ہر تحریک کے بنیادی ماخذ تک رسائی کے لیے اپنی سی کوشش کی ہے۔ کتاب کو پڑھ کر ان تحریکوں کے مقاصد، سرگرمیوں اور حکمت عملی سے واقفیت ہوتی ہے۔ لیکن چند پہلو قابل غور ہیں:

(۱) سب سے اہم کام ان تحریکوں کے علمی کام یا ان کے کاموں کے لیے علمی اعانتوں کا تجزیہ تھا کہ کس درجے، کس وزن اور کس وژن کے لٹریچر کو استعمال کیا جا رہا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکا۔

(۲) بھارت جیسے سیکولر اور کثیرالمذاہب معاشرے میں، غیرمسلموں میں کام کے لیے، ان تحریکوں کا کیا کردار ہے؟ مثال کے طور پر جماعت اسلامی ہند نے سب سے زیادہ زور بھارتی زبانوں میں ترجمہ قرآن اور دیگر تراجم پر دیا ہے اور یہ ایک اہم اور بڑا کام ہے (بدقسمتی سے بھارت میں بھی بیشتر مذہبی تنظیموں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اردو یا اردو بولنے، سمجھنے والی اقوام تک محدود سمجھ لیا ہے)۔

(۳) دیوبند کے تدریسی ماحول، نصابات و معیارات وغیرہ پر، گذشتہ پچاس برسوں کے دوران میں کیا اثرات مرتب ہوئے؟

(۴) ان تحریکوں نے تقسیم ہند کے بعد کون کون سے نئے تجربے کیے وغیرہ--- کچھ پتا نہیں چلتا۔

(۵) سلفیت، بریلویت اور شیعیت نے بھی تو تجربے کیے ہوں گے؟ مفصل نہ سہی، اس باب میں کچھ نہ کچھ معلومات ملنی چاہییں تھیں۔

اس قابل قدر کاوش کا سب سے غیر منصفانہ تبصرہ وہ ہے جس میں مصنف لکھتے ہیں: "تحریک اسلامی نے ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو زندہ اور متحرک اسلام سے وابستہ کیا، (مگر وہ) اب اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ جماعت اسلامی ایک گروہی جماعت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ مخلص کارکنان اب اکا دکا نظر آتے ہیں" (ص ۱۵۳)۔ اس پیوند سے پہلے اور اس کے بعد، جہاں جہاں جماعت کا تذکرہ آیا، بڑی محبت اور شیفتگی کے ساتھ آیا، لیکن متذکرہ بالا شدید تبصرہ شواہد کے بغیر سامنے آتا ہے تو تعجب ہوتا ہے اور قاری کے لیے ایک الجھاوے، صدمے یا مخمصے کا باعث بنتا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ یہاں مصنف کسی ذاتی اور محدود تجربے کو مجموعی طور پر پوری جماعت پر تھوپ کر عدل کا دامن چھوڑ گئے ہوں؟ (سلیم منصور خالد)

ایمان اور اخلاق، پروفیسر عبدالحمید صدیقی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۴۵۔ قیمت: ۴۸ روپے۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے مولانا مودودیؒ کی زندگی میں ایک طویل عرصے تک ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کی۔ ان کے علم و فضل اور مومنانہ بصیرت کے چراغ، ان کی تحریروں کا روپ دھار کر قارئین کی مسلسل رہنمائی کرتے رہے۔

"ایمان اور اخلاق" کے مباحث: وجود خالق کائنات، رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اشتراکیت وغیرہ۔ مصنف کا پیرایہ بیان دل نشین ہے۔ انھوں نے انسان کے لیے مقصد حیات کی اہمیت، مادی ترقی کی منشا اور حدود، فانی دنیا سے تعلق کی بنیادوں، صبر و توکل، عورتوں کے استحصال اور انسانی جان کی بے حرمتی کے اسباب و علل پر ایک شفیق معلم کی طرح کلام کیا ہے۔ یہ بیان و استدلال قاری کے دل و دماغ میں ایمان کی برقی رو اور عمل کے لیے تحرک پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ مقالات اس صدی کے چھٹے عشرے میں لکھے گئے تھے، تاہم ان میں بیان کردہ سچائی، ماہ و سال کی قید سے بالاتر ہے۔ (س - م - خ)

خطبات خلفاے راشدین، نصیر الدین حیدر۔ ناشر: مکتبہ القریش، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۳۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

مولف نے انتہائی محبت، خلوص اور جانفشانی سے خلفاے راشدین کے مکاتیب، فرامین، مکالمات اور ارشادات کو یکجا کر کے انھیں ایک خوب صورت لڑی میں پرو دیا ہے۔ اس سے چاروں خلفا کی سیرت، ان کے اپنے اقوال کے آئینے میں، نکھر کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے" اور "اللہ تعالیٰ نے میرے انبیاؑ کے علاوہ مخلوق میں سے میرے صحابہؓ کو چھانٹا ہے اور ان میں سے چار کو ممتاز کیا ہے، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔ ان کو میرے سب صحابہؓ سے افضل قرار دیا ہے"۔ ان ارشادات کے حوالے سے اگر اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ رسول پاکؐ کے تربیت یافتہ یہ لوگ اپنے قول اور فعل میں حد درجہ مخلص اور سچے تھے۔ ان کا ایک ایک لمحہ نبی کریمؐ کے عشق اور ان کی سچی پیروی کا آئینہ دار ہے اور یہ اس لیے ہوا کہ ان حضرات گرامی کی زندگی کا ایک ایک پل براہ راست پیغمبر انسانیتؐ کی صحبت اور نگرانی میں بسر ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ کتاب بھی دراصل سیرت النبیؐ ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کتاب میں ایک کمی یہ ہے کہ خطبات، فرامین اور خطوط وغیرہ کے ساتھ حوالے نہیں دیے گئے۔ مزید برآں پروف ریڈنگ احتیاط سے نہیں کی گئی۔ اردو الفاظ کی غلطیوں کے علاوہ آیات قرآنی کی غلطیاں طبیعت پر بہت گراں گزرتی ہیں، مثلاً: ص ۱۰۳، ص ۱۲۷۔ بہرحال یہ کتاب مصنف کی ایک اچھی کوشش ہے۔ قارئین کافی حد تک مستفید ہو سکیں گے۔ (سعید اکرم)

'The Rights of Muslim Woman: An Appraisal [مسلم خواتین کے حقوق: ایک جائزہ]، سید جلال الدین عمری۔ مترجم: شریف احمد خان۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، چتلی قبر، دہلی ۶۔ صفحات: ۲۲۹۔ قیمت: ۷۰ روپے۔

سید جلال الدین عمری خواتین کے موضوع پر اردو میں چھ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب، ان کی تصنیف "مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ" کا انگریزی ترجمہ ہے--- ابواب کی تفصیل سے مباحث کی وسعت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے: مغرب کا تصور حقوق نسواں اور اس کے نتائج (صنفی انارکی، خاندانی نظام کی شکست وریخت وغیرہ)، مسلم خاتون کے حقوق، مرد کی قوامیت کا مسئلہ، پردہ، خواتین کے معاشی مسائل، حق مہر کی نوعیت، مرد کے لیے ایک سے زائد شادیوں کی اجازت، طلاق، خلع،

وراثت' قصاص' دیت' عورت کی گواہی' عورت اور سیاسی قیادت وغیرہ۔ اس طرح اپنے موضوع پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔ خواتین کے حقوق پر اہل مغرب کے اعتراضات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ تاہم دور حاضر میں خواتین کو درپیش بعض مسائل جیسے: جدید علوم کی تحصیل' حصول ملازمت اور ڈرائیونگ وغیرہ پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ (بعض مسلم ممالک میں خواتین کو موٹر چلانے کا لائسنس جاری نہیں کیا جاتا)۔ ایک بات یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ انگریزی دان طبقے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے اہل مغرب کے مزید حوالوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت کی گواہی کے مسئلے پر قدرے تفصیل سے استدلال کرنا ضروری تھا۔ موجودہ شکل میں بھی یہ کتاب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے انگریزی قارئین کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔ (محمد ایوب منیر)

مشاہدۂ حق' علامہ آئی آئی قاضی۔ مرتب: محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی' حیدر آباد۔ سندھ: صفحات: ۲۰۸ قیمت: ۵۰ روپے۔

علامہ آئی آئی قاضی معروف دانش ور' مفکر اور عالم تھے۔ بقول محمد موسیٰ بھٹو: "سندھ نے پچھلے سو سال کے دوران میں ان جیسا فلاسفر اور دانا پیدا نہیں کیا جو فلسفے کے مسائل سے لے کر تاریخ عالم' مذاہب کی حقیقت' خود شناسی' نفس شناسی اور عرفان کے مسائل سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ان علوم کا ماہر بھی"۔

قبل ازیں انگریزی اور سندھی زبان میں ان کی تقاریر اور مقالات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں' اب ان کے منتخب مقالوں اور تقریروں کو اردو میں منتقل کر کے زیر نظر مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں: انسانی حقوق' قوموں کی بقا اور زندگی' معاشرہ: شاہ ولی اللہ کی نظر میں' مذہب و قانون' قوموں کے عروج و زوال میں کتاب کی اہمیت' خلفا کے دور میں جمہوریت' موجودہ دور میں ادب و ادیب کی ذمہ داریاں--- یہ تحریریں مرحوم کے وسعت علم' فکر و نظر کی گہرائی اور متوازن و معتدل نقطہ نظر کی عکاس ہیں اور قاری کو سوچ بچار کی دعوت دیتی ہیں۔ قرآن حکیم ان کے نزدیک سرچشمہ ہدایت و حقائق ہے مگر وہ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ قرآن کو نہ سنا گیا اور نہ سمجھا گیا: "آپ نے اسے پڑھا نہیں اور نہ ہی اس کا علم رکھتے ہیں۔ کاش آپ نے اسے پڑھا ہوتا کہ اس میں کتنی آیات ہیں' عجیب خوب صورتی ہے جس کو آپ نے دیکھا ہی نہیں"۔

اسی طرح نبی کریمؐ کا مقدس نام: "میرے لیے زندگی بخش ہوا کا جھونکا ہے' میں اس نام سے نہ تو کبھی سیر ہوا ہوں اور نہ کبھی ہو سکتا ہوں"۔ قومیں کیوں کر ترقی کرتی ہیں؟ اس کی طرف یوں ہلکا سا اشارہ کیا ہے: "جو قوم کوئی معیاری کتاب تخلیق نہیں کر سکتی' وہ دراصل اندھوں' گونگوں کی قوم ہے" (ص ۱۶۴)۔ وہ

افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ: "آج مکتبوں اور لائبریریوں کو قبرستانوں جتنی عزت بھی نہیں دی جاتی" (ص ۱۶۵)۔

ایک اور اقتباس دیکھیے: "دنیا کا بیشتر اور بہترین فن تعمیر مردہ لوگوں کے مقابر کی صورت میں موجود ہے، کیا ہماری تاریخ میں ایسا دور نہیں آئے گا جب ہم مردہ لوگوں پر مقابر تعمیر کرنے کے بجائے صحیح معنوں میں زندہ شریف النفس شخصیات کو زندہ و جاوید بنانے کے لیے ان کے لیے بہتر عمارات تعمیر کریں"۔ (ر-ہ)

تعلیمات قرآن، (دروس قرآن کا مجموعہ) حصہ دوم۔ ڈاکٹر سید حسن الدین احمد۔ ناشر: ثمینہ احمد اور برادران۔ بی ۱۳، بلاک ۴، گلشن اقبال، کراچی۔ صفحات: ۳۴۳۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

مولف عرصہ دراز سے سعودی عرب میں مقیم اور تعلیم و تدریس سے متعلق ہیں۔ فی الوقت وہ شاہ عبدالعزیز یونی ورسٹی جدہ میں انڈسٹریل انجینئرنگ کی تدریس و تحقیق میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے ۲۵ موضوعات پر ۳۵، ۴۰ منٹ دورانیے کے دروس قرآن مرتب کیے ہیں۔ زیر نظر حصہ دوم کے ۲۵ موضوعات یہ ہیں: تقویٰ، صبر، شکر، توکل علی اللہ، اخلاق حسنہ، اخلاق رذیلہ، حصول علم، والدین کا مقام، حقوق الزوجین، آداب مجلس، حقوق العباد، ایمان کے تقاضے وغیرہ۔

ہر درس، کسی منتخب آیت اور اس کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے اور اس کی توضیح و تفسیر دیگر قرآنی آیات، احادیث اور کہیں کہیں بعض واقعات سے کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ دروس علمی لحاظ سے بے حد مفید ہیں، مگر موجودہ حالات کے پیش نظر ان میں چند اضافوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ انسان کو حصول علم و تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی حالت زار کا جائزہ لینے اور قرآن کی روشنی میں اصلاح احوال کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز موجودہ حالات میں آیات قرآنی کے ہم سے کیا تقاضے ہیں؟ اور ان کو پورا کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں؟ (زبیدہ جبیں)

زمین بے قرار ہے، ساجد گل۔ ناشر: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، دوسری منزل، لیک روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۸۹۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

ہمارے اہل قلم نے اپنی تحریری کاوشوں کے ذریعے وہ حق ادا نہیں کیا، جس کا، جہاد کشمیر تقاضا کرتا ہے۔ خصوصاً ویت نام اور کوریا کے ہلاک شدگان کے لیے طول طویل مرثیے تحریر کرنے والے جغادری شاعر مہرِلب ہیں اور بیسویں صدی کی آخری دہائی کی اس سب سے بڑی تحریک حریت میں اپنا حصہ ڈالنے سے عاجز و درماندہ اور محروم ہیں۔ ان حالات میں ساجد گل ایسے نوآموز قلم کار، لائق تحسین ہیں، جنھوں نے جہاد

و شہادت کے مراحل کو بذات خود قریب سے دیکھا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے جذبات کا تحریری اظہار کرنے کی بہت عمدہ اور کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب میں کشمیر کی تاریخ، جغرافیہ اور حالیہ تحریک جہاد میں نوجوانوں کے کردار کا ذکر ہے۔ بیع نامہ امرتسر اور اقوام متحدہ کی قراردادیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ والدین کے نام شہید نوجوانوں کے خطوط بہت متاثر کن ہیں۔ بقول اقبال: ؎ دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، کلیم اختر اور طارق اسماعیل ساگر نے مصنف کی اس کاوش کو سراہا ہے۔ جہاد کشمیر کے بارے میں یہ مختصر مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔

(ز - ح)

مجلّہ پیغام قرآن (سہ ماہی)، ڈاکٹر گل رحیم جوہر۔ ناشر: ٹل، ضلع کوہاٹ۔ صفحات: ۷۵۔ قیمت: ۱۵ روپے۔

عیسائی مشنری ادارے انجیل اور عیسائیت کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے خط و کتابت کورس کے ذریعے ایک ایک فرد تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ اب اسلامی تحریکیں اور تنظیمیں بھی اس طریقہ تبلیغ کو اپناتے ہوئے قرآن کے پیغام کو عام کرنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر گل رحیم جوہر کا مجلّہ پیغام قرآن بھی اسی سمت میں ایک کاوش ہے جو بعض پہلوؤں سے منفرد ہے۔

اول: یہ کہ قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے لیے خط و کتابت کورس کے اجرا کے ساتھ گھروں، دفتروں، کارخانوں اور سکول کالجوں میں قرآن فہمی کے حلقے قائم کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے جو خواہ دو افراد ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔ شرکا کی عملی معاونت کے لیے اجتماعی مطالعے کے لیے منتخب نصاب، مجلّے کی صورت میں فراہم کیا جاتا ہے۔

دوم: مسلمانوں کے علمی ورثے کو نئی نسل تک منتقل کرنا اور ماضی سے رشتہ استوار کرنا علمی پیش رفت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف مکتبہ فکر کے جید علما کرام، مثلاً مولانا شبیر عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری اور دیگر مفسرین کی تفاسیر سے تزکیہ و تربیت اور صحیح فکر کی تعمیر کے پیش نظر جو انتخاب کیا گیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ اس سے امت مسلمہ میں فروعی و اختلافی مسائل سے ہٹ کر بنیادی اور مشترک مسائل پر تعاون کی ترغیب بھی دی گئی ہے جو اتحاد امت کا باعث بھی ہو گا جو وقت کا تقاضا بھی ہے۔ نیز قرآن کی عربی سکھانے کا جدید اور مختصر طریقہ کار بھی متعارف کروایا گیا ہے۔ نیز قرآن کی عربی سکھانے کے لیے جدید اور مختصر طریقہ کار بھی متعارف کروایا گیا ہے۔ اگر انگریزی زبان میں بھی ایسے کورس متعارف کروائے جائیں تو اہل مغرب تک قرآن کی دعوت پہنچانے کا فریضہ بخوبی ادا ہو سکتا

ہے۔

ڈاکٹر گل رحیم کی کاوش اچھی ہے مگر انتخاب میں عہد حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے موثر ابلاغ کے لیے عام فہم زبان اپنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ کمپوزنگ اور طباعت کا معیار بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ (امجد عباسی)

مطبوعات موصولہ

☆ **قرآن کریم کا اسلوب اور اعجاز**' پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن' نئی دہلی۔ صفحات: ۲۰۔ قیمت: ۶ روپے۔ [بمبئی یونی ورسٹی کے ایک سیمی نار کی تقریر' بہ قول مقرر' قرآن کریم: "نہ نظم ہے' نہ نثر' اس کا اپنا ہی اسلوب ہے۔ اس انداز و اسلوب کی کوئی کتاب نہ اس سے پہلے موجود تھی نہ آج ہے' نہ کل ہو سکے گی"۔ حوالوں کے ساتھ' ایک عالمانہ تقریر]۔

☆ **حدیث رمضان**' پروفیسر میاں محمد یوسف سجاد۔ ناشر: ادارہ تعلیمات اسلامی' گوہد پورہ' سیالکوٹ۔ صفحات: ۳۶۔ قیمت: "دعاے شفا براے مریض اہتمام کنندگان"۔ [روزوں سے متعلق جملہ مسائل' آسان زبان میں]۔

☆ **نذر وطن**' سید انجم جعفری۔ ناشر: احباب کمیونی کیشنز' ۰۷ بی شمع پلازا' فیروز پور روڈ' لاہور۔ صفحات: ۱۵۸۔ قیمت: درج نہیں۔ [ایک کہنہ مشق' خوش فکر اور دین دار شاعر کی قومی' ملی اور وطنی نظموں کا پر تاثیر مجموعہ۔ پیش لفظ از پروفیسر محمد منور]۔

☆ **اسوہ صحابہؓ**' محمد اسلام عمری۔ ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن' ۱۷۸۱' حوض سوئی والان' دہلی۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۵۰ روپے۔ [اصل موضوع ہے: گھریلو اور سماجی تعلقات۔ چھوٹوں بڑوں کے حقوق' ایثار' امانت' عبادت' تعزیت' شادی بیاہ' مہمان نوازی' اپنا کام خود کرنا' احتیاط اور احتساب وغیرہ' یعنی زندگی کے اسلامی آداب]۔

☆ **تحفتہ الشباب**' حافظ نثار احمد اعوان۔ ناشر: کتب خانہ رشیدیہ' مدینہ مارکیٹ' راولپنڈی۔ صفحات: ۱۴۸۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ [نئی نسل کی بے راہ روی' گمراہی' مغرب کی اندھی تقلید اور گوناگوں بے اعتدالیوں' ان کے اسباب اور ان کا علاج--- سیدھے سادے مگر دردمندانہ لب و لہجے میں ایک دلچسپ کتاب]۔

☆ **مستند مجموعہ وظائف**' مرتبین: اساتذہ بیت العلم۔ ناشر: زمزم پبلشرز' جنید مینشن نزد پاکستانی چوک' کراچی ۱۔ صفحات: ۴۵۱۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ ["سنت کے خلاف یا من گھڑت وظیفوں کے بجائے قرآنی دعاؤں اور وظائف و احادیث کا مجموعہ" ۔کم قیمت پر' ایک مفید کتاب]۔

مدیر کے نام

محمد نذیر چکوکا، بہاولنگر

اشارات : معیشت کی زبوں حالی (جنوری ۹۸) میں غربت اور امارت کے بڑھتے ہوئے فرق کی وجہ قرض اور سود کو قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس کا کوئی حل نہیں ہے؟ اگر ہے تو کیا ہے؟ زراعت کے لیے، صنعت کے لیے، غربت کے خاتمے کے لیے، قرضوں سے نجات کے لیے اور ٹیکس کے نظام کی بہتری کے لیے کیا منصوبے ہو سکتے ہیں؟ ان پر بھی روشنی ڈالنا چاہیے۔

ڈاکٹر حبیب اللہ چیمہ، لاہور

اشارات (جنوری ۹۸) حسب سابق دل و دماغ کی روشنی کا سامان ثابت ہوئے۔ اگر ان میں اشعار کے استعمال سے بچا جا سکے تو بہتر ہو گا۔ شعر کا استعمال نفس مضمون کو موثر بنانے کے بجائے خود اپنی طرف کھینچتا اور اشارات میں بیان کردہ نکات سے توجہ ہٹاتا ہے--- پروف خوانی بھی زیادہ توجہ سے کرنے کی ضرورت ہے۔

محمد عبداللہ صالح، بھکر

اشارات (جنوری ۹۸) نہ صرف امراض کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ علاج مرض بھی تجویز کرتے ہیں۔ البتہ طوالت اور ثقیل اصطلاحات بھی نمایاں ہیں۔ حکمت مودودیؒ میں "مختار کل انتظامیہ" کا انتخاب آپ کا حسن انتخاب ہے۔ رمضان المبارک کی مناسبت سے مضامین عمدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ترجمان کے کارکنوں کو مزید ہمت عطا فرمائے۔

راؤ شاہد انصار، منچن آباد

نسخہ شفا (دسمبر ۹۷) بہت اچھی تحریر ہے۔ اسی طرح خرم صاحبؒ کی دوسری تقاریر کو بھی تحریر کے قالب میں ڈھال کر ترجمان کی زینت بنایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عبدالقدیر سلیم خوب لکھتے ہیں۔ انھیں ذرائع ابلاغ کے منفی کردار کو موضوع بنانا چاہیے۔ مدیر ترجمان ملک کی زراعت، تجارت اور اقتصادی بہتری کے لیے خود انحصاری کا جامع منصوبہ اشارات میں پیش کریں تو بہت مفید ہو گا۔ شہری طبقہ زراعت کی اہمیت اور مشکلات سے ناآشنا ہوتا ہے، اس پر بھی کوئی تحریر آنا چاہیے۔ مسعود مفتی کی طرح مختار مسعود، اشفاق احمد اور صدیق سالک کی تحریریں بھی آئیں تو ادب پسند لوگوں کے لیے باعث کشش ہو گا۔ بعض موضوعات پر بحث و نظر کے عنوان سے گفتگو جاری رہنا چاہیے، مثلاً جنوری ۹۷ کے خرم مرادؒ کے اشارات: امت مسلمہ کا روشن مستقبل اور سلگتے مسائل۔ یہ مشعل راہ ہیں۔ اس پر تو اسٹڈی سرکل اور مکالمے ہونا چاہیے تھے۔ دس بارہ صفحات میں سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

نصیر خاں، کلر کہار

"قرآن روشنی ہے" (دسمبر۹۷) میں صاحب تحریر نے ترغیب علی القرآن کی خوب کوشش کی ہے مگر ایک جگہ قرآنی آیت کے بارے میں یہ لکھنا کہ "یوں لگتا ہے کہ یہ تنبیہ ہمارے لیے گھڑی گئی" قرآن کے ادب کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آیات کو حق کے ساتھ نازل فرماتے ہیں--- **ترجمان القرآن** میں لکھنے والے حضرات یہ بات کبھی نہ بھولیں کہ ترجمان کم تعلیم یافتہ لوگ بھی پڑھتے ہیں۔ اس لیے آسان الفاظ ہوتے ہوئے خواہ مخواہ مشکل الفاظ اور غیر عام استعارے اور کنائے استعمال کرنے سے بھی گریز کریں۔ ترجمان کے سارے سلسلے بہت عمدہ اور بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔

سید حامد عبدالرحمٰن، الکاف، یمن

پاکستان میں آئے دن دستوری، حکومتی اور عدالتی بحران پیدا ہونے کی بنیادی وجہ بھی یہی مستبدانہ نظام اور طرز حکومت ہے جسے عوام نے دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ بنو امیہ نے جس ملوکیت پر مبنی نظام کی بنیاد رکھی تھی، بیشتر ملکوں میں ویسا ہی طرز حکومت رائج ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خلافت کے شورائی اور انتخابی طرز حکومت کو اسلام کے سیاسی نظام کے جزو لاینفک کے طور پر ذہنوں میں بٹھایا جائے تاکہ مستبد افراد اور نظام سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو اور لوگوں میں اپنے سیاسی حقوق اور فرائض کا شعور بیدار ہو۔ عدلیہ کی آزادی کا حقیقی تصور، انتظامیہ میں جواب دہی کا احساس، آزاد فضا میں منتخب پارلیمنٹ کا صحیح کردار اور عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے باہمی تعاون کی فضا تب ہی پروان چڑھ سکے گی۔ یہ وقت کی پکار ہے۔ سید مودودیؒ نے **خلافت و ملوکیت** کے ذریعے اسی فکر کو عام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس فکر کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

سفیر اختر، اسلام آباد

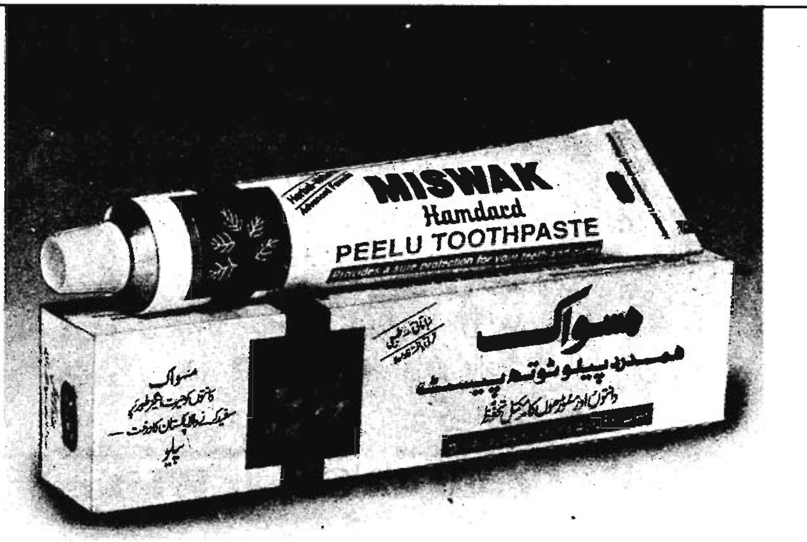
۱۹۹۷ کا اشاریہ دسمبر۹۷ کے شمارے میں آ جاتا تو زیادہ مفید ہوتا۔ تاہم اشاریے کی افادیت اپنے طور پر موجود ہے۔ حیرت ہے کہ جس تحریر سے مجھے بہت زیادہ دلچسپی رہی، (نوادرات مودودی: بحوالہ نظم علی اختر حیدر آبادی) اشاریے میں شامل نہیں ہو سکی۔

نصیر احمد راز، کھوٹہ

جن لوگوں نے معاشی ترقی کی رٹ لگا رکھی ہے اور اسے ہر درد کا درماں سمجھتے ہیں، برائے مہربانی ان کو گم راہی کا ایک اہم سبب (حکمت مودودی، دسمبر۹۷) کی ایک کاپی ارسال کر دیں۔

فرح رفیق، لاہور

پچھلے سات آٹھ ماہ سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ ہر بار یہی محسوس ہوا کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے ہے۔ انگریزی الفاظ کی کافی تعداد موجود ہوتی ہے۔ بین الاقوامی حالات کے بارے میں کافی چونکا دینے والے مضمون ہوتے ہیں لیکن اندرون ملک اور ہماری دعوت کے بارے مشکلات کے متعلق کوئی خاص وضاحت نہیں ملتی۔



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحّت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دارو مدار صحت مند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دار چینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص صحتِ دنداں کی مضبوط اساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

Adarts-HMPT-22/95



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC Cashmira BLANKETS
ABC KNITTING YARNS
Plush Mink BED COVERS AND BLANKETS
SANAULLA CARPET YARNS
SANAULLA WEAVING YARNS
Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK.

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

C .P.L. 236
Phone : 7587916
7585590
Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,